حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ

ایک شخصیت ● ایک عہد ● ایک تاریخ

۱۳۱۵ھ ـــ ۱۴۰۳ھ

۱۸۹۷ء ـــ ۱۹۸۳ء

تالیف

مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی

باہتمام

اسامہ عزیز عثمانی

مکتبہ العزیز جامع مسجد دیوبند

حکیم الاسلام
حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ
ایک شخصیت ☆ ایک عہد ☆ ایک تاریخ

۱۳۱۵ھ　　۱۴۰۳ھ

۱۸۹۷ء　　۱۹۸۳ء

تالیف
مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

باہتمام
اسامہ عزیز عثمانی

ناشر
مکتبہ العزیز، جامع مسجد، دیوبند

جملہ حقوق بحق مکتبہ العزیز دیوبند محفوظ ہیں.

کتاب کا نام: حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ
ایک شخصیت ☆ ایک عہد ☆ ایک تاریخ

تالیف: مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

صفحات: ۱۵۲

سن اشاعت: ۲۰۰۴ء

ناشر: مکتبہ العزیز جامع مسجد دیوبند، یوپی
پن: 247554 فون: 01336-224018

کمپیوٹر کتابت: تاج کمپیوٹرس، محلہ محل، دیوبند فون: 222790

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
۴	یہ کتاب	۱
۶	بندۂ مومن	۲
۱۱	الامام محمد قاسم نانوتویؒ	۳
۱۶	مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ	۴
۱۷	دارالعلوم دیوبند کا مسلک	۵
۲۱	مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ	۶
۲۳	تعلیم	۷
۲۹	شخصیت کے خدوخال	۸
۳۸	انتظامی صلاحیت	۹
۴۱	خطابت	۱۰
۴۲	معصومیت	۱۱
۴۳	عزم مستحکم	۱۲
۴۴	ذات بابرکت	۱۳
۴۶	ادبی مذاق	۱۴
۴۸	تصانیف	۱۵
۶۵	جو ہونا تھا ہو کر رہا	۱۶
۷۰	دارالعلوم دیوبند اور مولانا طیب صاحبؒ کی شخصیت کی تعمیر	۱۷
۸۵	وہ شب تاریک......	۱۸
۸۷	دو دارالعلوم	۱۹
۸۸	ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم!	۲۰
۹۰	نقوش و تاثرات	۲۱
۱۴۶	حرف آخر	۲۲
۱۴۹	حوالے	۲۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

①

یہ کتاب

ایشیاء کی معروف علمی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کے حالات کی ایک تصویر ہے، جس سے ان کی زندگی کے کچھ نقوش اس طرح ابھرتے ہیں جو امید ہے کہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے فائدے سے خالی نہیں ہوگی...... یہ کوئی مفصل سوانح عمری نہیں ہے بلکہ یوں کہئے کہ ان کی شخصیت کے نقش و نگار ہیں......ان کی زندگی کے نشیب و فراز ہیں. انسان بڑی مشکل سے بنتا ہے، اور جب کوئی انسان انسان بنتا ہے تو دوسرے انسانوں کو انسان بناتا ہے اس طرح اس کا فیضان عام سے عام ہوتا ہوا، ایک سے دوسرے دور تک پھیلتا چلا جاتا ہے.

قاری محمد طیب صاحبؒ ایک غیر معمولی انسان تھے، ایسے لوگ ہر دور میں بہت کم ہوتے ہیں. اس تالیف کا مقصد ان کے نقوش حیات کو محفوظ طریقے پر دوسروں تک پہنچانا ہے. اس مختصر سی کتاب میں صرف تاریخ ہی نہیں واردات بھی ہے، تاثرات بھی اور وہ معلومات بھی جو مؤلف کے سینہ سے سفینہ پر آئی ہیں.

مولانا طیب صاحب کے معصومانہ کردار کے ساتھ جس بے رحمی کا سلوک کیا گیا اس کا تصور بھی آتا ہے تو لگتا ہے جگر لہو بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑے گا...... راقم الحروف نے اس مرحلے پر بہت ضبط سے کام لیا ہے اور قلم کو تیشہ بننے سے روکا ہے......

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

دیوبند میرا وطن ہے، عمر کا بڑا حصہ دارالعلوم میں گذارا ہے، کانوں سے سنا ہی نہیں، آنکھوں سے دیکھا بھی ہے اور عقل سے سمجھا بھی ہے. دل نہیں چاہتا کہ ان تلخ یادوں کو تازہ کیا جائے...... تھوڑا بہت جو لکھا ہے وہ بھی اتنا ہی بس جس کا لکھنا ضروری تھا......

اس تالیف کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں اور اللہ کی رحمت سے امید رکھتا ہوں کہ دامن طیب سے وابستگی کی بدولت میرے سفر آخرت کی کٹھن منزلیں آسان ہو جائیں گی......

رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین.

فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی
دارالسلام اسلامی مرکز، مالیرکوٹلہ

جمعہ ۱۲رشوال المکرّم ۱۴۲۲ھ
۲۸ر دسمبر ۲۰۰۱ء

(۲)

بندۂ مومن

ہاتھ اللہ کا ہے بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا، کار ساز
خاکی و نوری نہاد ، بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز
اسکی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

• شاعرمشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

الحمد للّٰہ رب العالمین، الرحمٰن الرحیم. مالک یوم الدین، وصلاۃ اللّٰہ وسلامہ ورحماتہ وبرکاتہ علی صفوۃ عبادہ وخیرتہ من خلقہ محمد عبدہٗ ورسولہٗ، وعلی اہل بیتہ الطاہرین، وصحابتہ اجمعین ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین.

پروردگارِ عالم کی اپنے بندوں پر بے شمار نوازشیں ہیں. اس نے اپنے بندوں کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے. اس کے عطیات میں سے سب سے بڑا عطیہ، اس کی نوازشوں میں سے سب سے دل کش نوازش اور اس کی نعمتوں میں سے سب سے بافیض نعمت نبیوں اور رسولوں کی بعثت ہے، جن کو وہ ہر دور میں دنیا کے مختلف خطوں میں مقرر کرتا رہا ہے.

اللہ کے ان نبیوں اور رسولوں نے اپنے کردار و عمل سے انسانیت کی آبرو قائم رکھی ہے، ان کی ہدایت اور رہنمائی سے بھٹکے ہوئے قافلوں نے منزل کا راستہ معلوم کیا اور ان کی تعلیم سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتی شاداب ہوئی ہے.

اگر کائنات کے نقشے سے ان مقدس ہستیوں کے جوشِ عمل کو علیحدہ کر دیا جائے تو دنیا کی تاریخ جنگ و جدال کی پروحشت داستان اور ہوا و ہوس کی بے رونق کہانی کے سوا اور کیا رہ جاتی ہے. انسانوں میں ظلم اور انصاف، حق اور باطل میں فرق کرنے کا جو ملکہ پایا جاتا ہے اور آج انسانوں میں خدا کی مخلوق کی بے لوث خدمت کا جذبہ اور انسانی ہمدردی کا جو حوصلہ پایا جاتا ہے وہ ان ہی پاک باز شخصیتوں کی تربیت، بے پناہ جد و جہد اور زبردست قربانیوں کا نتیجہ ہے.

ان نیک ہستیوں نے ماحول کی ناسازگاری کے باوجود خدا کی مرضی کو پورا کیا اور اس کے احکام انسانوں تک پہنچا کر انسانیت کو نئی زندگی بخشی.

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کہ نبیوں کی جماعت کے سربراہ ہیں، اس لئے قدرتی طور پر آپ کی سیرت کا قالب بھی زیادہ دل پذیر اور مکمل ہے.

آپ کی زندگی کے حالات کا ایک ایک گوشہ خستہ حال اور بھٹکی ہوئی دنیا کی رہنمائی اور رہبری کے لئے اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے. آپ کی سیرت میں تمام پیغمبروں کی سیرتوں کا عطر، آسمانی ہدایت کا جوہر اور اثر انگیزی کا سب سے بڑا خزانہ چھپا ہوا ہے.

کیوں کہ آپ کی رسالت زمان و مکان کی حدوں میں مقید نہیں ہے بلکہ آپ تمام روئے زمین کیلئے اور تمام انسانوں کیلئے نبی مقرر ہوئے ہیں اس لئے آپ قیامت تک رہبری اور رہنمائی کا مرکز ہیں، آپ پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید نازل کی. وہ اپنے الفاظ و معانی کے ساتھ قیامت تک جوں کی توں باقی رہے گی. جیسا کہ خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحفظون. کہ یہ ذکر یعنی قرآن مجید ہم نے نازل کیا ہے. یہ ہمارا کلام ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کرینگے. اسی طرح قرآن مجید کی عملی تصویر یعنی حضرت محمد ﷺ کی سیرت کی حفاظت کا اس طرح انتظام کیا گیا ہے کہ آپ پر ایمان لانے والوں کی ایک ایسی جماعت آپ کی تعلیم و تربیت سے تیار ہوگئی جنھوں نے آپ کے طریقے کو نہ صرف یہ کہ خود مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھا بلکہ آپ کے ایک ایک عمل کو اور اس عمل کی پوری پوری کیفیت کو اپنے قول و عمل سے محفوظ رکھنے کے ساتھ اپنے بعد والوں تک من وعن پہنچایا.

اس طرح قرآن وسنت کے یہ دو مضبوط ستون ایسے ہیں جو پورے طور پر اللہ کے احکام اس کے دین و شریعت کو تھامے ہوئے ہیں.

صحابہ کے بعد ان کے بعد کے لوگ یعنی تابعین اور پھر تابعین کے بعد کے لوگ یعنی تبع تابعین اور اسی طرح ہر دور میں علمائے امت قرآن وسنت کو اپنے قول و عمل سے بعد والوں تک منتقل کرتے رہے. یہ سلسلہ دورِ نبوت سے آج تک جاری ہے. اور یقیناً تا قیامت جاری و ساری رہے گا.

اس بات کی اور زیادہ وضاحت کے لئے دو حدیثیں سامنے رکھ لیجئے، پہلی حدیث میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

ترکت فیکم امرین لن تَضلُّوا لَمَّا تَمسَّکتُم بِهِماَ...... کِتاَبُ اللّٰہِ و سُنَّۃ رَسُوْلِہ (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تمہارے لئے دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جب تک ان دونوں چیزوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے...... اللہ کی کتاب اور میری سنت.

اللہ کی کتاب قول ہے اور سنت اس پر عمل کا طریقہ ہے. الفاظ کی شکل میں قول کو تھامے رکھنا اور عمل کی شکل میں سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بس یہ دو ہی چیزیں ہیں جو عالم انسانیت کو گمراہی سے بچانے والی ہے.

دوسری حدیث جس میں آپ نے اپنی امت کے علماء کو بنی اسرائیل کے نبیوں کے مثل فرمایا ہے:

علماء اُمَّتی کَاَنْبِیَّاءِ بَنِی اِسْرائِیلِ.

میری امت کے علما بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں.

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرف اشارہ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ نبی اور رسول بنی اسرائیل میں بھیجے گئے اور وقت اور حالات کے مطابق ان کو الگ الگ معجزے عطا کئے گئے. جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزے عطا کئے وہ اس زمانے کے ماحول اور حالات کے لحاظ سے ضروری تھے. جادوگری کا زور تھا تو اس کے مقابلے میں عصائے موسوی دیا گیا.

اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں یہ تمام چیزیں جو گذشتہ انبیا کو الگ الگ عطا ہوئی تھیں ایک جگہ جمع کر دی گئیں. شاعر نے اس کو ایک شعر میں ادا کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

حسن یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضاداری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضرت یوسف کا حسن، عیسیٰ کی زندگی بخش سانسیں، حضرت موسیٰ کا ید بیضا یہ سب آپ کے اندر موجود ہیں، جو خوبیاں دوسروں میں الگ الگ تھیں وہ آپ کی تنہا ذات میں جمع کر دی گئی ہیں.

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے علما کو بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے تشبیہ دے کر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ وقت اور حالات کے مطابق جس طرح کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوگی، بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح وہ میری امت کے علما کو عطا کی جائیں گی، تا کہ یہ دین قیامت تک باقی رہے اور ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کرنے کی اس میں صلاحیت موجود ہو.

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس امت میں جیسے جیسے حالات پیش آئے اور جیسی جیسی ضرورت ہوئی اسی کے مطابق عالم ربانی پیدا ہوتے رہے.

فلسفے کا دور آیا تو امام غزالی ؒ (حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد الطّوسی متوفی ۵۱۵ھ ۱۱۳۱ء) اس کے مقابلے کے لئے موجود تھے. تاریخ کے حوالے سے بات ہوئی تو ابن خلدون (۱۳۳۲ء-۱۴۰۸ء) کی شخصیت سامنے آ گئی، یونانی علم کلام اور منطق کی بات ہوئی تو اس کے مقابلے کے لئے امت میں علما موجود تھے. اور یہ واقعہ ہے کہ امت کے ایک ایک عالم نے ایک ایک پیغمبر اور ایک ایک جماعت کا کام انجام دیا.

(۳)

الامام محمد قاسم نانوتویؒ

اسی طرح کے دین کے بابصیرت عالموں میں ایک بڑا امتیاز اور نمایاں نام حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا سامنے آتا ہے. مولانا نانوتویؒ صاحب ۱۲۴۸ھ بمطابق ۱۸۳۲ء میں دیوبند سے مغرب کی جانب سولہ میل کے فاصلے پر ایک پرانے قصبے نانوتہ میں پیدا ہوئے۔[1] اس قصبے میں نویں صدی ہجری سے صدیقی شیوخ کا ایک ممتاز خاندان آباد ہے. حضرت نانوتویؒ کا نسبی تعلق اسی خاندان سے ہے.

حضرت نانوتویؒ نے انچاس سال سے کم عمر میں ۴/ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء جمعرات کے روز دیوبند میں وفات پائی. دارالعلوم کی شمالی جانب قبرستان قاسمی میں پہلی قبر مولانا نانوتوی صاحبؒ کی بنی، جس کو حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی نے حضرت نانوتویؒ کے خاندان کے لئے وقف کردیا تھا. کیوں کہ یہ خاندانی قبرستان ہے اس لئے کسی اور کی تدفین کے لئے ان کے وارثوں سے اجازت لینی ضروری ہوتی ہے. مولانا نانوتویؒ غیر معمولی صلاحیتوں کے روشن فکر عالم دین تھے. جہاں وہ ذہانت، عالی دماغی، فہم وفراست میں ممتاز تھے وہیں نیکی اور خداپرستی میں بھی بے مثال تھے. مولانا نانوتویؒ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ۱۵/ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۰/ مئی ۱۸۶۷ء جمعرات کے دن دیوبند میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے نام سے

[1] (سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب صاحب صفحہ ۲۴ طبوعہ دارالعلوم دیوبند، اشاعت ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء)

اس درس گاہ کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر دارالعلوم دیوبند کے نام سے علوم اسلامیہ کا عظیم الشان مرکز بنا. قیام دارالعلوم میں حضرت نانوتویؒ کے ساتھی جوان کے دست و بازو بنے تین نمایاں شخص تھے.

۱-مولانا فضل الرحمٰن...... پیدائش ۱۲۴۷ھ ۱۸۳۱ء

وفات ۳/جمادی الاول ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۵/جون ۱۹۰۷ء

۲-حاجی سید محمد عابد صاحبؒ دیوبندی...... پیدائش ۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء

۳-مولانا ذوالفقار علی عثمانی دیوبندی...... پیدائش ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۱ء

وفات ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء

اسلام میں علم سے مراد وہ علم ہے جو نبوت سے مستفاد ہو اور انسان کی دینی، دنیوی، مادی اور روحانی زندگی کے لئے مفید ہو. دارالعلوم دیوبند جو دراصل ہندوستان میں علم کی اشاعت اور ایک دینی تحریک کا عنوان ہے اس کا نصب العین اور مقصد بھی وہ علم ہے جو دنیا میں انسان کو ایک با مقصد اور صحیح زندگی گذارنے کے لئے تیار کرے جس کی بنیاد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقے پر ہو.

۱۹/ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ جمعہ کے دن دیوبند کی جامع مسجد میں تقسیم انعام کا ایک جلسہ ہوا. جس میں حضرت نانوتویؒ نے ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی. اس تقریر میں دارالعلوم کے قیام کی ضرورت، اس کی اہمیت اور اس کے نصاب تعلیم پر روشنی ڈالی گئی. اس تقریر کے چند اقتباسات:

''چند خیر خواہانِ بے غرض نے بنام خدا اس قصبہ دیوبند میں مدرسہ کی طرح ڈالی اور تمام بنی آدم خصوصاً اہل اسلام کی بہبودی کی صورت نکالی، سو بحمد للہ اپنے خیال سے بڑھ کر اس نے رونق پائی، اور یہاں کی دیکھا بھالی جا بجا مدرسے مقرر ہوئے اور اس آخری زمانے میں علم کا پھر اس طرح چرچا ہوا جیسا کہ گل ہوتے ہوئے چراغ سنبھالا لیا کرتا ہے. اور بحمد للہ سینکڑوں آدمی اس دولت عظمیٰ سے اس مدرسے میں آ کر

مستفید ہوئے اور تھوڑا بہت اپنی لیاقت کے موافق حصہ لے اڑے، مگر سب دور نزدیک کے رہنے والے جانتے ہونگے کہ اس مدرسہ کی بنیاد دیوبند والوں نے ڈالی اس امر میں وہ سب کے امام ہیں. ہر چند اور باہر کے صاحب بھی اس کار خیر میں شریک ہوئے مگر جو کچھ ہے وہ دیوبند والوں ہی کا طفیل ہے اور اس وجہ سے اگر یوں کہا جائے کہ جتنا اور سب کو اس کار خیر کا ثواب ملے گا اتنا ہی تنہا دیوبند والوں کو ملے گا تو عین قولِ نبویؐ مَنْ سَنَّ سُنَّۃً فَلَہٗ اَجْرُہَا وَ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِہَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ (اوکما قال) واقعی اہل دیوبند نے وہ کام کیا ہے کہ قیامت تک صفحہ روزگار پر ان کی یادگاری رہے گی. یہ نامی مدرسہ ہمیشہ اہل دیوبند کی یادگاری کا باعث رہے گا. چونکہ اور اکثر مدارس اس مدرسہ کی دیکھ بھالی مقرر کیے گئے یا کیے جاتے ہیں تو کوئی مدرسہ اس سے ترقی پا جائے ہر اہل عقل کے نزدیک وہ بھی دیوبند ہی کا پرتو ہوگا اور اس پر جب یہاں کے باشندوں کی شکستہ حالی اور پریشان روزگاری پر نظر کی جائے تو یہ ان کی ہمت کی بات کسی طرح ان کاموں سے کم نہیں، جو اہل سلطنت نے رفاہِ عام کیے ہیں. بایں ہمہ کھانے کی امداد میں طالب علموں کے ساتھ جو دل سوزی یہاں کے باشندوں نے کی وہ اتنی نہیں کہ ہم زبان سے ادا کریں. فرشتوں نے اگر طالبانِ علوم کے قدم کے نیچے پر بچھائے تو انھوں نے ان کے سر پر دستِ شفقت رکھا ماں باپ کو بھلا دیا دیوبند کو مثل گھر بنادیا یہ وہ خاص بات ہے. جس میں شرکائے چندہ میں سے کوئی ان کا شریک و سہیم نظر نہیں آتا، اس کے عوض خداوند کریم یہاں کے باشندوں کو دارین میں جزائے کامل عطا کرے. بالجملہ اس دولت بے زوال سے بدولت اہل دیوبند عالم مستفید ہے. ہند کے چند طالب علم جو شوقِ علم سے مکہ معظّمہ میں پڑھتے تھے دیوبند کے مدرسہ کا چرچا سن کر گرتے پڑتے مدرسہ دیوبند میں آپہنچے.

جمیع علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم اور ان کی استعدادوں کے حاصل کرنے کیلئے یہ مدرسہ اور سہارنپور کا مدرسہ بلا تامل عمدہ سامان ہے اور انشاء اللہ یہاں کے طالب علم

بشرط تکمیل باقی علوم قدیمہ اور جدیدہ کو بوجہ قوت استعداد بسہولت جلد حاصل کر سکتے ہیں. وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرضِ اعظم قوتِ استعداد کے فقط علوم دینی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فنون دانش مندی کی تکمیل بھی حسب قاعدہ سابقہ کی گئی ہے. جس کا عمدہ نتیجہ پہلے زمانوں میں یہ ہوا تھا کہ بڑے بڑے عالم بڑی بڑی استعداد اور قوت کے اہل اسلام میں بکثرت ہوئے اس لئے ہم اس بات کو بالیقین سمجھتے ہیں کہ یہاں کے طالب علم اگرچہ بعض علوم وفنون جدیدہ سے کامیاب نہ ہوئے ہوں پر ان کے حق میں یہ ان کی استعداد مثل استاد کامل تعلیم کیلئے کافی ہو اور مدارس میں اگرچہ بعض علوم جدیدہ کی کثرت کے باعث طالب علموں کو ایک مشق تازہ ان علوم کی ایسی ہو جو یہاں کے طالب علموں کو نہ ہو پر اہل انصاف کے نزدیک بامعنیٰ ان علوم میں بھی ان مدارس کے طالب علموں سے زیادہ ہی یہاں کے طالب علم سمجھے جائیں گے.

بایں ہمہ اگر بالفرض بوجہ مشق نہ ہونے بعض علوم جدیدہ کے کچھ نقصان بھی متصور ہو تو بوجہ مفقود ہونے قوت استعداد علمی اور نہ ہونے علوم دینی کے ان مدارس کے طلب علم بدرجہا یہاں کے طالب علموں سے ناقص ہونے چاہئیں.

اب ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ درباب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا اور علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا، منجملہ دیگر اسباب بڑا سبب اس بات کا ایک تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص ہو اس پہلو کا لحاظ چاہئے کہ جس طرف سے کمال میں رخنہ پڑا ہوا ہو ادھر توجہ ہو سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانۂ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی، ہاں علوم نقلیہ کا تنزل ہوا کہ ایسا تنزل کبھی کسی زمانے میں نہ ہوا ہوگا ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل لا حاصل نظر آیا اور صرف بجانب علوم نقلی اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مرجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہیں، ضرور سمجھا گیا.

دوسرے یہ کہ زمانۂ واحد میں علوم کثیرہ کا تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے، ہاں بعد تحصیل فنون دانش مندی جس کو خاص تحصیل استعداد ہی کے لئے تجویز کیا ہے اگر اور فنون قدیمہ و جدیدہ کو حاصل کیا جائے تو البتہ مقدار زمانہ تحصیل برابر رہے گا. اس تقدیم و تاخیر سے مطلب بخوبی حاصل ہوگا اور استعداد ہر علم کو بخوبی حاصل ہوگی، اس لئے علوم نقلیہ اور ان کے ساتھ علوم دانش مندی کو داخل تحصیل کیا اس کے بعد اگر طلبہ مدرسہ ہٰذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی، کاش گورنمنٹ ہند بھی قید عمر طلبۂ نو داخل کرا اڑا دے تا کہ رفاہِ عام رہے اور سرکار کو بھی معلوم ہو کہ استعداد سے کیا کرتے ہیں. بالجملہ یہ مدرسہ ایک ذخیرۂ خیر اور سرمایہ علم وادب واستعداد ہے. جس کے طفیل سے آج خداوند ذوالجلال نے یہ دن دکھلایا. کہ چند طالب علموں نے یہاں تعلیم پا کر استعدادِ کامل حاصل کی، ہر فن میں مناسبت معقول اور ہر علم میں لیاقت مناسب پیدا کر کے اقران وامثال میں ممتاز ہوئے.

(تاریخ دارالعلوم جلد اول، صفحہ ۱۶۹ تا ۱۷۲)

حضرت نانوتویؒ کی اس تقریر سے دارالعلوم کا نصب العین، اس کی تعلیم کا مقصد خوب اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے.

(۴)

حافظ محمد احمد صاحبؒ

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادے مولانا محمد احمد صاحب کو ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے انتخاب پر دارالعلوم دیوبند کا مہتمم بنایا گیا. مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے اپنے اہتمام کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کو علمی اور مالی اعتبار سے مستحکم بنانے کیلئے بڑی جدو جہد کی اور اس کیلئے ایک بڑی اسکیم کا نقشہ تیار کیا اور اہتمام کے کاموں میں مدد کے لئے ۱۳۲۴ھ میں بطور معاون مہتمم مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کے فرزند رشید مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کا دفتر اہتمام کی درخواست پر مجلس شوریٰ نے انتخاب کیا.

۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء میں نظام حیدرآباد نے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کو حیدرآباد کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے عہدۂ افتاء پر تین سال کے لئے بمشاہرہ ایک ہزار روپے ماہانہ تجویز فرمایا جس کو دارالعلوم کے حکومت حیدرآباد کے ساتھ خاص تعلقات کی وجہ سے منظور کرنا پڑا لیکن مولانا محمد احمد صاحب کو صدر مہتمم اور مولانا حبیب الرحمٰن کو نائب مہتمم مقرر کردیا گیا.

۳/ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء کو مولانا حافظ محمد احمد صاحب کا حیدرآباد میں انتقال ہوگیا...... وہ شاہی قبرستان خطۂ صالحین میں مدفون ہیں. ۳/ رجب المرجب ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بھی وفات پا گئے. مولانا حبیب الرحمٰن دارالعلوم کے شمال میں قبرستان قاسمی میں مدفون ہیں.

(۵)

دارالعلوم دیوبند کا مسلک

۱۳۴۱ھ ۱۹۲۲ء میں مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو نائب مہتمم بنایا گیا اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی وفات کے بعد قائم مقام مہتمم مقرر کیا گیا اور پھر ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء میں مجلس شوریٰ نے آپ کو مہتمم کے منصب پر فائز کیا.

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی پر کچھ کہنے سے پہلے آیئے ایک نظر اس پر ڈالتے چلیں کہ دارالعلوم دیو بند کا اصل مسلک کیا ہے اور اس کا کیا امتیاز ہے، جو اس کو دوسرے مسلکوں سے ممتاز کرتا ہے. اسکے اثرات علمی طور پر اور معاشرے پر کیا مرتب ہوئے ہیں، کیوں کہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا اصل کام جو انھوں نے اپنی زندگی میں انجام دیا دین کی وہ ترویج و اشاعت ہے جو مسلک دیو بند کے نتیجے میں ایک خاص صورت میں آگے بڑھی ہے.

- دیو بند کے علماء اہل سنت والجماعت ہیں. اہل سنت والجماعت کا مطلب یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی جو تعبیر اور طریقہ صحابہ کرام کو بتایا صحابہ کرام اسی طریقۂ نبوی کو لے کر آگے بڑھے. قرآن اور سنت کی نظر میں صحابہ کرام مجموعی طور پر حق پر قائم رہے اس لئے وہ خود بھی حامل حق رہے اور ان کی عدالت و امانت ہر طرح قابل اعتماد ہے.

دیو بند کے علماء کا ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے دین حق کو سمجھنے کے لئے صحابہ کرام سے لے کر ائمہ محدثین اور بعد تک کے علماء امت کو نظر انداز نہیں کیا، ان کی

کاوشوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا لیکن ساتھ ساتھ اس کا بھی لحاظ رکھا کہ ان کا کوئی عمل یا قول قرآن وسنت سے ہٹا ہوا تو نہیں ہے. کوشش یہ کی گئی کہ ان کے مقام ومرتبے کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر کوئی بات قرآن وسنت سے ہٹی ہوئی نظر آئے تو اس کی مناسب تاویل کی جائے اور اگر تاویل ممکن نہ ہو تو اس کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی باقی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے. کیوں کہ جس طرح قرآن وحدیث کے الفاظ سلسلہ بہ سلسلہ متوارث ہیں اسی طرح ان پر عمل کا طریقہ بھی سلسلہ بہ سلسلہ متوارث ہے. اگر درمیان کی کڑیوں کو ناقابل اعتبار ٹھیرالیا جائے تو دین پر اعتماد اٹھ جائے گا. لیکن اگر شخصیات کی پیروی میں قرآن وسنت کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کی بنیاد ہل جائے گی. اس طرح علمائے دیوبند نے مقلد ہوتے ہوئے بھی محقق کا کردار اس احتیاط کے ساتھ ادا کیا کہ نہ تو تحقیق کے زعم باطل میں شخصیات کو نظر انداز کیا جائے اور نہ شخصیات پر انحصار میں تحقیق کا دامن چھوڑا جائے.

اس کے نتیجے میں دین کی تعلیمات اس طرح نکھر کر سامنے آتی ہیں کہ اس کی ہر ہر چیز پر عمل بھی ہو جاتا ہے، ہر عمل کا صحیح مقام بھی متعین ہو جاتا ہے. اس میں کسی طرح کا غلو اور افراط وتفریط نہیں ہوتی اور ایک خاص ذوق کتاب وسنت پر عمل کا اس طرح بن جاتا ہے کہ شخصیات کا احترام بھی ہے، ان کی خدمات کا اعتراف بھی ہے، ان کی قدر ومنزلت بھی ہے اور دین اپنی اصل شکل وصورت میں علمی اور عملی بنیادوں پر قائم ہے.

یہ ہے وہ دیوبند کا اصل مذاق اور مسلک جس نے اس کو عالم اسلام میں ایک امتیاز عطا کیا ہے اور کوئی شک نہیں کہ اس کا سلسلہ جو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے شروع ہوا اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند نے اس کو خاص حکیمانہ انداز میں پیش کیا، جس کو ہم حکمت قاسمیہ کا عنوان دیں تو بالکل مناسب ہے. اسی نکھرے ہوئے ذوق ومزاج کو لے کر یہ کاروانِ علم آگے بڑھا اور

حضرت مولانا قاسم نانوتوی صاحبؒ کے بعد مولانا محمد احمد صاحبؒ، مولانا انور شاہ صاحبؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب، مولانا حسین احمد مدنی صاحب، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی صاحب اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسے لوگ اس علمی کارواں کو لے کر چلتے رہے۔

اس بات کو اور زیادہ صاف کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جس سے علماء دیو بند کے انداز فکر کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

درالعلوم دیو بند کے محدث علامہ انور شاہ کشمیریؒ امام ابن تیمیہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ابن تیمیہ کا علمی مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اگر میں ان کی بلندی کو دیکھنے لگوں تو میری ٹوپی نیچے گر جائے گی مگر پھر بھی نگاہ ان کی بلندی تک نہیں پہنچ سکے گی۔

ابن تیمیہ کے علمی رتبے کے اس کھلے دل سے اعتراف اور اقرار کے باوجود علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کہتے ہیں کہ اگر ابن تیمیہ استواء علی العرش کے مسئلے پر بحث کرنے کے لئے میرے پاس آئیں تو میں ان کو درس گاہ میں اندر آنے نہیں دونگا۔ یعنی اس خاص مسئلے پر ان سے اختلاف بھی ہے مگر یہ اختلاف ان کے مرتبے کے اعتراف میں مانع نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ التحیات میں شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنے کے قائل نہیں ہیں اور اس کو بدعت سمجھتے ہیں۔

اس کے باوجود کہ حضرت مفتی صاحبؒ مجدد الف ثانیؒ کے معترف بلکہ معتقد ہیں اور ان کے مکتوبات اور ملفوظات کا ترجمہ بھی کیا ہے، مگر اس حسنِ اعتقاد کے باوجود صاف کہتے ہیں کہ ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے والے اور امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں مجدد الف ثانیؒ کے مقلد نہیں ہیں۔

یہ عادلانہ اندازِ فکر علمائے دیو بند کا خاص امتیاز ہے.

حدیث پر عمل کرنے کے سلسلے میں علماء امت کا ذوق یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے کوئی حدیث ایسی نہ رہ جائے جس پر عمل نہ ہو. اس لئے حدیث اگر اپنی روایت کے اعتبار سے ضعیف بھی ہو اور مختلف طریقوں سے اس کی روایت نے اس کے ضعف کو دور کر دیا ہو تو وہ ہر حال میں اس پر عمل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں.

تصوف کے نام پر جس طرح سنت کے چشمہ صافی کو گدلا کرنے کی کوشش کی گئی، علمائے دیو بند نے اس کو صاف کیا. تصوف کے نام پر ترکِ دنیا کے تصور کو ختم کیا اور عمل میں اخلاص، للّٰہیت، تقویٰ، پرہیز گاری، تعلق مع اللہ جس کو حدیث میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کو اپنے قول و عمل سے اس طرح آگے بڑھایا کہ شریعت اور طریقت میں کوئی ٹکراؤ نہیں رہا. بلکہ سکّے کا ایک رخ شریعت اور دوسرا رخ طریقت بن گئی.

حصولِ برکت سے انکار نہیں کیا گیا مگر تبرک اور برکت کے نام پر بدعت و خرافات کو داخل نہیں ہونے دیا گیا.

اولیاء اللہ کا احترام، ان کی خدمات کا اعتراف ضرور کیا گیا مگر شخصیت پرستی کا وہ انداز جس نے تصوف کے لبادے میں شریعت کو کھوکھلا کر دیا تھا اور خدا پرستی کی جگہ پیر پرستی نے لے لی تھی اور وہ دراصل دنیا پرستی بن گئی تھی...... اس کو جڑ سے ختم کر دیا گیا.

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ دیو بند نے اس بت کدۂ ہند میں قرآن و سنت کے صاف و شفاف اور نکھرے ہوئے تصور کو اس طرح حکیمانہ اور معقولانہ انداز میں پیش کیا کہ نظام شریعت اپنی اصل شکل و صورت میں اگر کہیں نظر آیا تو دیو بند کے آئینے میں دکھائی دیا.

اور پھر یہ اعتبار پورے ملک میں بلکہ عالم اسلام میں قائم ہو گیا کہ اگر کسی مسئلے میں علماء دیو بند متفق نہیں ہیں تو اس کو قابل اعتماد نہیں سمجھا گیا.

علماء دیوبند نے سیاست سے کنارہ کشی نہیں کی مگر اسلام کو سیاست کا لبادہ پہنے نہیں دیا.☆

یہ وہ ذوق وفکر ہے جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی قیادت میں ایک کارواں کی صورت میں آگے بڑھا اور ان کے اخلاف اس کو لے کر چلتے رہے. حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ اسی حکمت قاسمیہ کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے.

(٦)

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ۱۸/رجب ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۳/دسمبر ۱۸۹۷ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے، آپ کا تاریخی نام مظفر الدین ہے جس سے ہجری سال ۱۳۱۵ھ نکلتا ہے.

م	ظ	ف	ر	ا	ل	د	ی	ن	
۴۰	۹۰۰	۸۰	۲۰۰	۱	۳۰	۴	۱۰	۵	کل: ۱۳۱۵

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا آبائی وطن قصبہ نانوتہ ہے جہاں ان کے اجداد میں سے مولوی محمد ہاشم صاحب نے شاہ جہاں کے زمانے میں رہائش اختیار کی تھی. نانوتہ دیوبند سے بارہ کوس مغرب میں سہارنپور سے ۱۵/کوس جنوب میں، گنگوہ سے

☆(دیوبند کے مسلک کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں راقم کی کتاب اسلام، اسلامی فکر اور مسلک دیوبند، مطبوعہ دار الاسلام، دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ، پنجاب).

۹ رکوس مشرق میں، دہلی سے چار منزل سات کوس ہے. قاری صاحبؒ کا وطن ثانی دیوبند ہے، جہاں ان کے دادا مولانا قاسم نانوتوی صاحبؒ نے نانوتہ چھوڑ کر رہائش اختیار کی تھی.

مولانا طیب صاحب کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

محمد طیب......ابن (حافظ) محمد احمد......ابن (مولانا) محمد قاسم......ابن شیخ اسد علی...... ابن شیخ غلام شاہ...... ابن محمد بخش...... بن علاؤ الدین...... بن فتح محمد...... بن محمد مفتی......بن عبد السمیع...... بن (مولوی) محمد ہاشم......اس سے آگے نسب حضرت قاسم بن محمد ابو بکر صدیق تک جا پہنچتا ہے.

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے چھوٹے بھائی مولانا محمد طاہر تھے جو کچھ عرصہ دارالعلوم میں صنعت و حرفت کے شعبے میں دارالصنائع کے ناظم بھی رہے. قاری صاحب کی ایک چھوٹی بہن تھیں جن کا نام طیبہ تھا، جن کی شادی دیوبند کے ایک بڑے رئیس سید محتشم صاحب سے ہوئی تھی. سید محتشم صاحب اور انکے چھوٹے بھائی سید محترم کو ایک سازش کے تحت ریل کے سفر میں دیوبند کے قریب شہید کر دیا گیا تھا اور سید محتشم صاحب کے دولڑکے سید محمد احتشام اور سید محمد واصف پاکستان سے امریکہ منتقل ہو گئے ہیں اور وہیں پر ان کی رہائش ہے.

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے تین صاحبزادے الحمد للہ حیات ہیں......بڑے صاحب زادے مولانا محمد سالم صاحب قاسمی ہیں، جو اس وقت دارالعلوم (وقف) کے مہتمم ہیں، دوسرے صاحب زادے مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی ہیں جو دارالعلوم (وقف) میں استاذ حدیث اور اچھے مصنف و خطیب ہیں، تیسرے صاحب زادے محمد اعظم قاسمی ہیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلامیات کے شعبہ میں پروفیسر ہیں......ایک صاحب زادے محمد عاصم تھے جن کا ۴۲ء میں چودہ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا......تین صاحب زادیوں میں سے ایک صاحب زادی

ہاجرہ نازلی تھیں.ان کی شادی مولانا حامد الانصاری غازی سے ہوئی تھی......مولانا حامد الانصاری غازی صاحب کا بمبئی میں انتقال ہوگیا ہے.

(مولانا حامد الانصاری غازی کی وفات ۱۶/اکتوبر ۱۹۹۲ء کو ہوئی، ولادت ۱۹۰۷ء کی تھی)

آپ کی بڑی صاحب زادی فاطمہ تھیں جن کی شادی رشید صاحب (بریلی) سے ہوئی تھی، تیسری اور چھوٹی صاحبزادی حمیرہ ہیں جن کی شادی سید محتشم صاحب اور بہن طیبہ کے بیٹے احتشام صاحب سے ہوئی. ان کی ایک صاحبزادی عذرا تھیں جن کی شادی دیوبند کے ڈاکٹر افضال صاحب سے ہوئی تھی. ان کا بائیس سال کی عمر میں انتقال ہوگیا تھا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی شادی 1915ء میں ہوئی، اس وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی......ان کی اہلیہ کا نام حنیفہ خاتون تھا جن کا تعلق رامپور منیہاران سے تھا. اندر گڑھ گوالیار کے قریب ایک ریاست تھی جہاں ان کے والد وزیر تھے اس لئے زیادہ قیام وہیں رہتا تھا.۱۹۷۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا تھا.

(۷)

تعلیم

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی پوری تعلیم شروع سے آخر تک دارالعلوم دیوبند میں ہوئی.انھوں نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ اور صرف دوسال میں مکمل قرآن مجید حفظ کرلیا.پھر باقاعدہ تجوید وقرأت کی مشق قاری عبدالوحید صاحب سے کی.

ان کی تعلیم کی بسم اللہ بھی بڑی شان کے ساتھ ہوئی.ایک خاص تقریب میں ان کی بسم اللہ کرائی گئی اوراس میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن عثمانی دیوبندی، شیخ طریقت مفتی اعظم مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، اوران کے والد مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ، قاری صاحبؒ کے والد حافظ محمد احمد صاحبؒ اور بہت سے بزرگ شریک ہوئے اوران کی دعاؤں کے ساتھ قاری صاحبؒ کی بسم اللہ ہوئی.مولانا فضل الرحمٰن نے اس مبارک مجلس کی تاریخ اس قطعہ سے نکالی تھی.

حبذا مکتب طیب کی مبارک تقریب
کہ نئی طرح کا جلسہ تھا نئی طرح کی سیر
رب یسر جو کہا اس نے تو بیروئے ابا
فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمم بالخیر

ت	م	م	ب	ا	ل	خ	ی	ر	
۴۰۰	۴۰	۴۰	۲	۱	۳۰	۶۰۰	۱۰	۲۰۰	۱۳۲۳ھ

حفظ قرآن اور قرأت وتجوید کی تکمیل کے بعد دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی وریاضی میں داخلہ ہوا،اوراس کا پانچ سالہ نصاب مکمل کر کے سند فراغت حاصل کی.

دارالعلوم دیوبند کے درجۂ فارسی کے پانچ سالہ نصاب میں فارسی کی ابتداء سے اعلیٰ درجے تک کی بڑی بڑی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں،جن میں گلستاں،بوستاں، مثنوی مولانا روم،سکندر نامہ،انوار سہیلی اور فارسی گرامر میں احسن القواعد وغیرہ.

اس کے علاوہ حساب میں چکرورتی،اقلیدس.

انشا میں رقعات امان اللہ حسینی،رقعات عالم گیری.

یہ پانچ سالہ نصاب ہائی اسکول کے معیار سے بھی اوپر کے درجے کا تھا،اوراس کی تکمیل کے بعد اردو، فارسی، حساب،تحریر وانشا ان تمام ضروری مضامین کی اچھی استعداد پیدا ہوجاتی تھی.اس کے بعد ہی طالب علم کو درجات عربی میں داخل کیا جاتا تھا.

چنانچہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو بھی شعبۂ فارسی وریاضی کی پانچ سالہ تکمیل کے بعد درجات عربی میں داخل کیا گیا۔ ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۸ء میں آپ نے درجات عربی سے فراغت پاکر سند فضیلت حاصل کی۔

حدیث میں آپ کے خصوصی استاد حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ تھے۔ حدیث کی خصوصی سند آپ کو مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری سے حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ مولانا عبداللہ صاحب انصاری اور اپنے والد مولانا محمد احمد صاحب سے بھی حدیث کی سند لی۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے استادوں میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی، انکے برادر خورد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا شبیر احمد عثمانی اس کے علاوہ مولانا اصغر حسین دیوبندی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہی، شیخ المنطق مولانا ابراہیم بلیاوی اور مولانا رسول خان جیسے مشہور علماء شامل ہیں۔

اپنی تعلیم وتربیت کے بارے میں خود مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''چودھویں صدی ہجری کے شروع اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں میری پیدائش ایسے ماحول میں ہوئی کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب وتمدن کے سانچے ٹوٹ رہے تھے، اور ایک نئی تہذیب وتعلیم کا غلغلہ تھا۔ میری پیدائش میرے جدامجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانئ دارالعلوم دیوبند کے گھرانہ میں ہوئی ہے، جو اپنے وقت میں علم ودین کے مجدد تھے اور ان کی زندگی سادہ، توکل پسندی، کم سے کم اسباب، معیشت اور جفاکشی کا نمونہ تھی، ان کی اہلیہ محترمہ میری دادی صاحبہؒ حضرت نانوتویؒ کے فیضان صحبت اور رفاقت سے براہِ راست مستفید تھیں۔ دادی صاحبہ اپنی عبادت وریاضت، سخاوت، کشادہ دلی، شعائر دین پر پختگی، نماز روزہ، ذکر شغل کی

پابندی میں اپنی مثال آپ تھیں.

میرے والد مرحوم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور ان کی والدہ صاحبہ میری دادی مرحومہ کے زیرسایہ مجھے تعلیم وتربیت نصیب ہوئی.ان کی ساری ضروریات زندگی میں بیحد سادگی، مزاج میں انکساری اور تواضع کے ساتھ ان سینکڑوں طلباء دارالعلوم کے لئے جو ملک و بیرون ملک سے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے آتے اور دارالعلوم میں جمع ہوتے تھے...... میری دادی صاحبہ والد مرحوم اور سارے گھرانہ کی طرف سے غیر معمولی شفقت اور ہر وقت ان کی تعلیمی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی دھن تھی.بس یہی ماحول تھا جس میں میں نے آنکھ کھولی.

والد مرحوم کا یہ ایک قصہ ضرور قابل ذکر ہے کہ دارالعلوم کے ایک طالب علم نے دُھلے ہوئے گیلے کپڑے سکھانے کے لئے دارالعلوم کی مسجد میں ڈالے، والد صاحب مرحوم نے دیکھا تو خفا ہوئے اور ڈانٹ ڈپٹ کی.مگر بعد میں اپنے جذبۂ ترحم سے اپنی سخت گیری پر جو صرف مسجد کی حرمت کے لئے تھی اتنے متاسف ہوئے کہ اس طالب علم کو بلا کر اس سے معذرت کی اور کئی ہفتے اپنے ساتھ کھانے میں شریک رکھا.یہ گویا طلبہ دارالعلوم کے حق میں ان کی پدرانہ شفقت کا ایک بے اختیارانہ جذبہ تھا جو طلبہ میں معروف تھا.

یہاں ایک واقعہ یہ بھی بیان کرنا مناسب ہوگا کہ میری دادی صاحبہ ایک دفعہ امروہہ ضلع مرادآباد تشریف لے گیں، جہاں میرے دادا صاحب کے ممتاز شاگرد حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی تشریف فرما تھے، وہ امروہہ ہی کے باشندے تھے، حضرت مولانا امروہی مرحومہ دادی اماں کو اسٹیشن سے پالکی میں اس شان سے گھر لائے کہ کہاروں کے ساتھ پالکی کو اٹھانے والوں میں خود بھی شریک تھے، یہ تھا اس دَور میں اپنے اساتذہ اور ان کے متعلقین کے ساتھ اور ان کی اولاد کے ساتھ شاگردوں کا ادب واحترام.میرا تعلق ایک ایسے ماحول سے رہا ہے جس میں دین

کے سب ہی شعبوں بالخصوص دینی تعلیم اور دین کے نادار طلبہ سے محبت وشفقت زندگی کا ایک بڑا فرض سمجھا جاتا تھا. میرے آباواجداد نے طلبۂ علوم دینیہ کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے. اور یہاں تک کہ بعضوں کی شادی کی تقریبات بھی خود ہی انجام دیں. کتنے ہی علماوفضلا ہیں جن کی مجالس نکاح ہمارے گھر پر آراستہ ہوئیں. حضرت قبلہ علامہ انور شاہ صاحبؒ کی شادی بھی میرے والد صاحب کے اہتمام سے ہوئی.

حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد جامعہ قاسمیہ خود دیوبند کے اونچے خاندان کے فرد تھے. ان کی تقریب شادی بھی میرے والد صاحبؒ نے کی. غرض کہ میرا گھرانہ علماء وفضلاء عصر کا مورد تھا، دوسرے متعدد علماء و فضلا نے سالہا سال تک میری دادی صاحبہ اور والدہ صاحبہ کے زیرِ سایہ راحت وآرام سے وقت گذارا، تعلیمی زندگی میں مجھے وقت کے یگانۂ روزگار علماء اور فضلا کرام سے استفادہ کا موقع ملا.

حفظ قرآن اور تجوید قرأت میں مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ، فارسی میں مولانا یٰسین صاحب (والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحب) فنون میں ابوالاساتذہ حضرت مولانا غلام رسول ہزارویؒ اور علوم کتب وسنت میں علامہ دہر، یگانہ روزگار الاستاذ الاکبر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ، مولانا اعزاز علی امروہی، مولانا رسول خاں ہزارویؒ اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ میرے اساتذہ ہیں، اپنے رفقاء درس میں بڑے بڑے فضلا کو جمع پاتا ہوں لیکن جن رفقاء کے ساتھ تعلیمی دور کا اکثر وقت گذرا. ان میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا سید بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ اور مولانا میرک شاہ کشمیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں. یہ حضرات بھی اپنے علم وفضل میں بے نظیر ہیں.

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید محمد میاں دیوبندی یہ سب حضرات میرے بعد کے فضلاء دارالعلوم میں سے ہیں۔ اساتذہ نے کس قدر غیر معمولی شفقت کا ثبوت دیا اسکے بارے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حدیث شریف کے استاد اعلیٰ تھے مگر بے حد نازک مزاج اور حساس طبیعت کے بزرگ تھے۔ طلباء کی ذراسی غفلت پر خفا ہو جاتے۔ ایک دفعہ طلباء کی کسی غلطی پر خفا ہو کر گھر بیٹھ گئے اور دارالعلوم میں سبق پڑھانا موقوف کر دیا۔ طلباء پر استاد کی خفگی کا بہت بڑا اثر ہوا۔ مشوروں کی مجلس منعقد ہوئی اور طلباء نے یہ طے کیا کہ حضرت مولانا عثمانی کو منانے کے لئے ان کے سامنے مجھے پیش کیا جائے حالانکہ میں خود بھی اس سال حضرت کے ہاں ایک طالب علم ہی تھا۔

چنانچہ میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں جا کر عرض معروض اور طلباء کی طرف سے ندامت کا اظہار کیا تو حضرت نے خندہ پیشانی سے میری سفارش قبول فرمائی اور فوراً ہی مدرسہ تشریف لے آئے اور اسباق کا سلسلہ شروع کر دیا۔

میرے ساتھ بزرگوں کی یہ شفقت و عنایت دیکھ کر اکابر کی کشیدگیوں کو دور کرنے کیلئے اساتذہ کی طرف سے مجھے ہی منتخب کیا جاتا تھا۔

⑧

شخصیت کے خدوخال

حضرت قاری صاحب کی گفتار، رفتار، نشست و برخاست ہر چیز میں ایک نفاست جھلکتی تھی. گفتگو کرنے میں نہ آواز بہت بلند ہوتی تھی اور نہ اتنی پست کہ سنائی نہ دے. نہایت شیریں لب و لہجے میں ایک ایک لفظ علیحدہ علیحدہ موتیوں کی جگمگاتے الفاظ معلوم ہوتے تھے...... آواز کا زیروبم بھی بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا. قد بہت موزوں تھا نہ بہت لمبا تھا اور نہ پست. جسم نہ موٹا اور بھدا اور نہ اتنا دبلا پتلا بلکہ موزوں اور متناسب جسم تھا. لباس عالمانہ اور باوقار ہوتا تھا. دوپلی ٹوپی ذرا اونچی باڑ کی جوان کی اٹھی ہوئی پیشانی پر بہت زیب دیتی تھی...... نشست میں تواضع جھلکتی تھی. چھوٹی سے چھوٹی بات کی بہت قدر کرتے تھے...... مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ہاتھ میں لینے کی چھڑی بہت سبک اور ہلکی سی دیکھنے میں خوبصورت نظر آتی تھی حضرت کیلئے خریدی اور اس وقت صرف ایک روپے کی آئی تھی. اس کو کاغذ میں لپیٹ کر میں نے حضرت کی خدمت میں پیش کیا. ان کے پاس ایک سے ایک قیمتی اور اچھی سے اچھی چھڑی تھی لیکن میرے اس ناچیز تحفے کی اتنی قدر کی کہ کئی دنوں تک اسے اپنے ہاتھ میں رکھا اور گھر میں بھی اس کا کئی بار ذکر کیا کہ یہ میرے لئے ہلال میاں لیکر آئے ہیں.

شروع سے ہی کچھ اس طرح کا انداز رہا کہ میں نے بڑے آدمیوں کی شخصیت کا جائزہ ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے لیا ہے.

ایک مرتبہ میں نے اپنے تائے ابا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے پوچھا کہ آپ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (صدر جمہوریہ ہند) سے بہت قریب رہے ہیں ان کی خاص بات کیا تھی.

مفتی صاحب نے اس کے جواب میں جو بات کہی وہ شخصیت کے ناپنے کا مجھے ایک پیمانہ اور معیار معلوم ہوتی ہے. انھوں نے کہا کہ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنے لان کی گھاس کو صاف کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور صدر جمہوریہ کی کرسی پر بیٹھے ہوئے بھی، جتنے عظیم وہ صدر جمہوریہ کی کرسی پر نظر آئے اتنے ہی عظیم وہ اپنے لان کی گھاس صاف کرتے ہوئے نظر آئے.

یہی بات میں حضرت قاری صاحبؒ کے بارے میں کہتا ہوں کہ وہ اپنے گھر میں اپنے رشتہ داروں میں اور دیوبند کی گلیوں میں چلتے ہوئے اتنے ہی عظیم نظر آئے جتنے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کے منصب پر.

میری نانی صاحبہ محترمہ زینب معصوم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے بہت بے تکلف تھیں اور دونوں میں سگے بہن بھائیوں کا سا رشتہ معلوم ہوا کرتا تھا. میری نانی. عمر میں بڑی تھیں اس لئے قاری صاحب ان کو آپا کہا کرتے تھے...... مولانا حبیب الرحمٰن میری نانی کے سگے ماموں تھے. وہ کہا کرتی تھیں کہ مولانا طیب صاحب چھوٹے سے ماموں حبیب الرحمٰن صاحب کی انگلی پکڑے ہوئے اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے. جیسے ابھی یہ بڑے نظر آتے ہیں بس ویسے ہی یہ بالکل چھوٹے سے نظر آیا کرتے تھے یعنی وہی انداز اور وہی طور وطریق اور تمیز وادب بچپن سے ان میں اسی طرح تھا جیسے بڑے ہوکر آج ان میں ہے. میرے خیال میں یہ جملہ حضرت قاری صاحب کی شخصیت کی بہترین ترجمانی کرتا ہے. اگر اردو کے محاورے ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کو ہم ذہن میں رکھ لیں تو معلوم ہوگا کہ نوعمری سے ہی حضرت قاری صاحب کی تعلیم وتربیت میں وہ تمام چیزیں سموئی جارہی تھیں اور بٹھلائی جارہی تھیں جن سے آگے چل کر اس امت کو اور عالم انسانیت کو بڑا فیض پہنچنا تھا. یوں بھی کچھ ہی

لوگ ہوتے ہیں جو تاریخ کے کسی موڑ پر دنیا میں آ کر ایسے کام کر جاتے ہیں کہ صدیوں تک وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔ اس کو مبالغہ اور خوش عقیدگی نہ سمجھا جائے تو میں صاف صاف عرض کرونگا کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے ابتدائی معمار اور پھر اس کو ایک مرکزی صورت دینے والے جو ہمیں مولانا قاسم نانوتویؒ سے لے کر علامہ انور شاہ کشمیری تک اپنے اپنے میدان میں نہایت اہم لوگ نظر آتے ہیں جیسے ان سب کا جوہر اور ان کا نچوڑ حکیم الاسلام مولانا طیب صاحب کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے جمع کر دیا تھا، وہ عالم بھی تھے، منتظم بھی تھے۔ خطیب بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ ان کی فکر اور ان کی شخصیت بڑی متوازن تھی اور جب نہایت اہم اور نازک مرحلوں پر ان کے قائدانہ جوہر کھلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت نرم دم گفتگو گرم دم جستجو کا نمونہ ہے۔ مسلم پرسنل لا پر زد پڑنے لگی تو جس عزم اور پختگی اور استقامت کے ساتھ انھوں نے کہا اور عمل کیا اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک نیا حوصلہ دے دیا۔ اسی طرح جب بھی کوئی کش مکش کی صورت پیدا ہوتی تھی تو حضرت مولانا طیب صاحب اس کا دفاع بھی کرتے تھے اور اس کا حل بھی کرتے تھے، ایک بار نہیں بارہا اس طرح کے منظر سامنے آئے ہیں کہ ان کی رائے کی صلابت اور عزم کی پختگی اور تدبر نے بڑے سے بڑے مسئلے کو چٹکیوں میں حل کر دیا۔ دارالعلوم بارہا ایسے حالات و مسائل سے دوچار ہوا ہے اور ساٹھ سال کی طویل انتظامی زندگی میں وہ چٹان کی طرح مضبوط، سمندر کی طرح پرسکون نظر آئے ہیں۔

• حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ دفتر اہتمام کے تمام کاموں پر پوری طرح نظر رکھتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ جب بھی دیوبند میں ہوتے تھے پورے وقت دفتر میں بیٹھ کر پورے انہماک کے ساتھ دفتر کے کاغذات اور آنے والی ڈاک خود دیکھتے تھے اور اکثر اپنے قلم سے جوابات لکھا کرتے تھے۔ حضرت قاری صاحب کی تحریر بہت خوبصورت تھی۔ چھوٹے چھوٹے حروف صاف صاف موتیوں کی طرح ٹکے ہوئے

ہوتے تھے. خط کے جوابات بڑے مکمل اور شافی ہوتے تھے اور ان سے اپنائیت کا اظہار ہوتا تھا.

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مہتمم صاحب پاکستان تشریف لے گئے اور وہاں قیام طویل ہوگیا یہاں تک کہ یہ خیال ہونے لگا کہ معلوم نہیں کہ واپسی کا ارادہ ہے یا نہیں؟ ان کی عدم موجودگی میں دارالعلوم دیوبند کا سالانہ جلسہ تقسیم انعامات ہوا. یہ جلسہ بڑا اہم ہوتا تھا اور ذمہ دار اور طلبا پوری دلچسپی سے اس جلسے میں شریک ہوتے تھے. حضرت مہتمم صاحب کی عدم موجودگی میں جلسہ بڑا بے کیف معلوم ہوا، اور میں نے اس تاثر کا اظہار حضرت کے نام خط میں اس طرح سے کیا کہ آپ کے نہ ہونے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے بارات ہو مگر اس کا دولہا نہ ہو. اسی زمانے میں نائب مہتمم مولانا مبارک علی صاحب کا بھی انتقال ہوا تھا اور وہ میرے دادا مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ کے خلیفہ تھے. ان کے انتقال کا بھی دل پر بہت اثر تھا. یہ دونوں باتیں ایسی ہوگئیں کہ حضرت کے نام خط خاصا پر درد ہوگیا. حضرت نے فوراً ہی اپنے قلم سے اس کا جواب بہت ہی تسلی اور تشفی دیتے ہوئے تحریر فرمایا. اس میں ایک جملہ مجھے یاد ہے کہ مولانا مبارک علی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم کے بارے میں یہ تھا کہ انہیں نسبت صلاتیہ حاصل تھی اور واقعی مولانا مرحوم نماز کا بڑا اہتمام فرمایا کرتے تھے.

مولانا عبدالحق صاحب غازی پوری جن کے صاحبزادے مولانا عبداللہ جاوید الحمد للہ حیات ہیں. حضرت کے پیش کار معتمد خصوصی اور مزاج شناس تھے. اس لئے اہتمام کے تمام کام بڑے سلیقے سے اور بغیر تاخیر کے انجام پاتے تھے. کیوں کہ حضرت مہتمم صاحب کا غذات اور خطوط وغیرہ کے نمٹانے میں بہت مستعد رہتے تھے.

• حضرت کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ جب بھی دیوبند میں ہوتے تھے تو عصر کے بعد یا مغرب کے بعد بلکہ زیادہ تر عصر کے بعد حضرت کے مکان پر مجلس ہوا کرتی تھی. جس میں علماء طلبا اور اہل شہر بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے...... یہ مجلس کیا تھی

حقیقت میں حکمت دین کی درس گاہ تھی. لوگ مختلف قسم کے سوالات کرتے تھے. حضرت اس کے جوابات اس طرح سے دیتے تھے کہ سوال کوئی ہو بات گھوم پھر کر دین پر ہی آجاتی تھی. اس طرح یہ دینی مجلس دین کے بے شمار حکمتوں کی گرہ کشائی کرتی تھی. حضرت کا اندازِ بیان اتنا دلچسپ اور آسان ہوتا تھا کہ ہر طرح کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا لیتے تھے. اس میں علماء بھی ہوتے تھے، عام لوگ بھی ہوتے تھے. یہاں تک کہ ہم لوگ جو بچپن کی منزل میں تھے وہ بھی سمجھ لیتے تھے اور ہمیں بھی اس میں لطف آیا کرتا تھا. بعض اوقات لوگ سیاسی سوال بھی کرتے تھے، گو حضرت کا مزاج معروف معنی میں سیاسی نہیں تھا مگر حضرت اس سوال کا جواب بھی خندہ پیشانی سے دیتے تھے اور ہوتا یہ تھا کہ تان اس کی دین پر ہی ٹوٹتی تھی. اس مجلس میں کسی کی غیبت نہیں ہوتی تھی، کسی پر تنقید نہیں ہوتی تھی. یہ بڑی خیر کی مجلس ہوا کرتی تھی جس کی یاد اب بھی آتی ہے تو دل تڑپ جاتا ہے کہ ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'' اب کہاں سے وہ ''حکیم الاسلام'' آئیں گے جن کی باتوں سے بڑے بڑے مسئلے چٹکیوں میں حل ہو جایا کرتے تھے.

- حضرت کے معمولات میں یہ چشم دید بات ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد صلوٰۃ اوّابین میں حضرت قرآن مجید کے ایک دو سپارے روزانہ پڑھا کرتے تھے. اکثر میں بھی جب حاضر ہوتا تو پیچھے نیت باندھ کر کھڑا ہو جاتا تھا. حضرت کچھ تھوڑی بلند آواز میں جو مجھے سنائی دیتی رہتی تھی قرآن مجید کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، وہ قاری بھی تھے، حافظ بھی تھے، صاحب دل بھی تھے، صاحب نظر بھی تھے. ان کی تلاوت میں کچھ عجیب ذائقہ ہوا کرتا تھا کہ ہم جیسے لاأبالی جو ابھی ذمہ داری کے دور میں داخل نہیں ہوئے تھے. ہم بھی اس طویل قرأت سے اکتاتے نہیں تھے.

- حضرت کا ایک معمول تھا کہ سفر میں بھی برابر مطالعہ اور لکھنے میں مشغول رہتے تھے. یعنی سفر ہو یا حضر، ان کے معمولات مطالعہ کے اور تحریر کے برابر جاری

رہتے، یہ بھی بڑی عجیب بات تھی کہ ٹرین کی حرکت کا اثر ان کی تحریر پر نہیں پڑتا تھا اور وہ اسی طرح لکھتے رہتے تھے. اکثر کھڑکی کے پاس لمبائی کی نشست پسند کرتے تھے تا کہ روشنی مناسب آتی رہے.

ان تمام مصروفیات کے ساتھ آپ اپنے گھر والوں کے لئے بھی اچھا خاصا وقت نکالا کرتے تھے، گھر والوں کے ساتھ بیٹھتے تھے ان سے باتیں کرتے تھے، وہ زاہد خشک نہ تھے بلکہ طبیعت میں ایک لطیف مزاح تھا. بچہ یا بوڑھا کوئی بھی ہو ان کی باتیں سننے میں دلچسپی لیتا تھا. گھر میں بھی ان کی باتیں بے تکلف، سادہ اور معلومات افزا ایسی ہوا کرتی تھیں، جیسے باہر مجلسوں میں یا تقریروں میں...... یعنی ان کی گھر کی اور باہر کی زندگی میں تضاد نہیں تھا.

بچوں کے ساتھ بالکل بچوں کی طرح پیش آتے تھے. ان کا حوصلہ بڑھاتے تھے. ان کی باتوں میں شریک ہوتے تھے. یاد ہے کہ بچپن میں ایک مرتبہ میں نے اور مولوی اسلم صاحب نے جو ان کے منجھلے صاحبزادے ہیں اور میرے ہم عمر ہیں اور ہمارے ساتھ کچھ اور دوستوں نے مل کر ایک جلسہ کیا. ہمارے مکان کے سامنے ایک میدان سا پڑا ہوا تھا. جس میں چار دیواری تھی. جس کو گھیر کہا کرتے تھے کیوں کہ وہ دیوار سے گھرا ہوا تھا. ہم بچوں نے مل کر اس میدان کی بڑی صفائی کی، اس وقت لاؤڈ اسپیکر کا عام رواج نہیں تھا اور دیو بند میں شاید پہلی مرتبہ کرائے پر دینے کے لئے لاؤڈ اسپیکر آیا جو صرافہ بازار میں نریش کی دوکان پر آیا تھا. ہم نے اس سے لاؤڈ اسپیکر کی بات طے کی. پانچ روپے کرایہ طے ہوا اور ہمارے جلسے میں لاؤڈ اسپیکر لگایا گیا. یہ شاید دیو بند میں بچوں کا پہلا جلسہ تھا. جس میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ہوا تھا. حضرت مہتمم صاحب اسکے مقرر خصوصی تھے، آپ نے بچوں کی مناسبت سے تقریر فرمائی. جلسے کے بعد چائے مٹھائی کا بھی انتظام تھا. اس میں بھی شرکت فرمائی. خوب حوصلہ بڑھاتے رہے. یہ جملہ اب بھی کانوں میں گونج رہا ہے کہ "جلسہ تمہارا بڑا کامیاب رہا"

• حضرت کا معمول تھا کہ دیوبند کے مختلف لوگوں سے میل ملاپ اور تعلقات رکھتے تھے. گاہے گاہے ان سے ملاقات کے لئے جایا کرتے تھے. جن میں ایک ہمارا گھر بھی شامل تھا اور اکثر بغیر کسی سواری کے پیدل ہی جاتے تھے. نپے تلے ہلکے ہلکے قدم متواضع رفتار جس میں وقار بھی تھا. دیوبند کی گلیاں جیسے ان کے چلنے سے سج جاتی تھیں. جب بھی آتے تھے بڑی محبت آمیز گفتگو ہوتی تھی. جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا کہ میری نانی زینب معصوم سے بڑی بے تکلفی کا انداز ہوتا تھا. مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میری نانی جن کو ہم اماں جان کہا کرتے تھے انھوں نے پوچھا ''بھائی جی کبھی گھر میں کھانا کھالو یا ہمیشہ سفر میں ہی رہو'' اس پر حضرت نے بڑا ظریفانہ جواب دیا کہ ''آپا جب روزی تقسیم ہورہی تھی تو قسام ازل نے مونٹھ ماری اور دانے بکھر گئے انہی کو چگتا پھرے جاؤں.''

اس جواب میں ظرافت بھی تھی اور حقیقت بیانی بھی کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں کا دانہ اور روزی لکھی ہے وہاں جانا ہوتا ہے.

ایک منظر جیسے اب بھی آنکھوں میں پھرتا ہے. حضرت مہتمم صاحب اپنی والدہ کا بہت احترام کرتے تھے. جب ان کے سامنے آتے تھے تو بالکل بچے سے ہو جاتے تھے. ہم نے ان کی والدہ کو بچپن میں دیکھا تھا سب ان کو اماں بی کہتے تھے...... مختصر سا قد، گورا چٹا رنگ، ہلکا پھلکا جسم، بالکل گڑیا سی معلوم ہوا کرتی تھیں...... ضعیفی کی جھریوں میں بھی ایسا لگتا تھا جیسے اس میں نور کی کرنیں بہہ رہی ہیں...... وہ منظر مجھے یاد ہے کہ مہتمم صاحب سفر حج پر تشریف لے جارہے تھے. اماں بی چاہتی تھیں کہ وہ بھی ساتھ حج کو جائیں. مگر کسی وجہ سے ایسا نہیں ہو پارہا تھا. حضرت مہتمم صاحب ان کے قدموں سے آنکھیں مل رہے تھے اور آنسوؤں سے ان کے پیر دھوتے ہوئے ان سے حج پر جانے کی اجازت مانگ رہے تھے. بس ہمیں اتنا یاد ہے کہ اماں بی بہت ناراض ہورہی تھیں اور حضرت مہتمم صاحب اسی طرح ان کے سامنے گڑگڑا رہے

تھے...... جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے ...... اس کی تصویر بالکل ہمارے سامنے تھی.

• ابتداء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ سے بیعت ہوئے تھے. ان کے وصال کے بعد مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تربیتی تعلق قائم ہوا، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا کیوں کہ اس پورے گھرانے سے خصوصی تعلق تھا اس لئے مولانا حبیب الرحمٰن نے ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ دی اور ان کی شخصیت کو پروان چڑھانے، بنانے اور نکھارنے میں سب سے بڑا ہاتھ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا ہے. راقم الحروف سے خود ایک مرتبہ حضرت قاری صاحب نے فرمایا تھا کہ مجھے تایا جی یعنی مولانا حبیب الرحمٰن نے کام کا طریقہ اس طرح سکھایا ہے جس طرح بچے کو سبق پڑھاتے ہیں.

ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ انتقال سے کچھ پہلے اپنے پاس بٹھا کر جو نصیحتیں فرمائیں اور انتظام کے رموز واسرار مجھے سمجھائے وہ مجھے آج بھی پوری طرح یاد ہے. ان میں سے ایک بات جو حضرت قاری صاحب نے فرمائی تھی وہ آج بھی میرے لوحِ ذہن پر ثبت ہے. مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے کہا تھا کہ ''میاں طیب تعلق بنانا آسان ہے نبھانا مشکل ہے تعلق وہی بناؤ جو نبھا سکو''

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت قاری صاحب کو تدریس کا موقع بہت کم مل سکا. حالاں کہ اصلاً ان کا مزاج علمی تھا لیکن حالات نے ان کو انتظامی امور سنبھالنے پر مجبور کر دیا. انتظامی بکھیڑوں میں پڑنے کے باوجود ان کا علمی ذوق اسی طرح تازہ تھا. خوب مطالعہ کرتے تھے. تصنیف وتالیف کا بھی مشغلہ رہا اور ان کی خطابت وتقریر نے جیسے ہندوستان میں خطابت کی ایک نئی تاریخ لکھ دی. ان جیسا مقرر اس آدھی صدی میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا. کمال یہ ہے کہ تقریر کی جو خوبیاں سمجھی جاتی ہیں. نشیب وفراز، اشارے اور انداز، آواز کا زیر وبم، کبھی رلانا، کبھی ہنسانا ان میں سے کوئی ایک بات بھی

ان کی تقریر میں نہ تھی لیکن پھر بھی ان کی تقریر اتنی موثر، اتنی باکمال، اتنی جامع، اتنی مرتب، اتنی سلیس اور اتنی آسان ہوتی تھی کہ بڑے بڑے دقیق مسئلے اتنی آسانی کے ساتھ بیان کر دیتے تھے کہ ہر طرح کا آدمی اس کو سمجھ لیتا تھا.

حکمت قاسمیہ کی ترجمانی اپنی تقریر و تحریر، قول و عمل سے اپنے مزاج اور مذاق میں جذب کر کے جس شرح و بسط کے ساتھ امت کے سامنے پیش کی ہے. شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے بعد ان کا کوئی ثانی نہیں ہے.

معصومیت، حسن اخلاق اور علم و عمل کا یہ پیکر جس نے بہترین اساتذہ کی آغوش میں تربیت پائی تھی، جب دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر جلوہ افروز ہوا تو آدھی صدی سے زیادہ تک اپنی کرنیں اس طرح پھیلاتا رہا کہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ اس کے جلووں سے روشن ہو گیا اور دور دراز کے ملکوں تک دارالعلوم کی آواز اس طرح پہنچی کہ اعتبار اور وقار کا ایک اور ہی منظر سامنے آنے لگا. حقیقت یہ ہے کہ قاری محمد طیب صاحب ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک پورے عہد کا نام ہے. یہ علماء سلف کی آخری یادگار اور ایسی جامع کمالات شخصیت تھی جس نے دیوبند اور دارالعلوم کو دنیا کے نقشے پر اس طرح چمکا دیا کہ ملک میں کوئی تحریک ایسی نہیں اٹھی کہ جس کی قیادت دیوبند کے ہاتھ میں نہ ہو. تحریک خلافت ہو یا مسلم پرسنل لاء بورڈ مدارس کے قیام کی تحریک ہو یا آزادئ ہند کی تحریک ہر جگہ صف اول کے قائد دیوبند اور دارالعلوم کے نظر آئیں گے.

(۹)

انتظامی صلاحیت

علمی ذوق اور مزاج ہونے کے باوجود حضرت قاری صاحبؒ میں انتظامی صلاحیت کم نہ تھی۔ ایک ایسے ادارے کا نظام چلانا جس میں مختلف فکر ورجحان کے لوگ ہوں کوئی آسان بات نہیں ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی جگہ پر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو دار العلوم دیوبند کا شیخ الحدیث مقرر کیا گیا۔

مولانا حسین احمد صاحبؒ اپنے علمی مقام اور مرتبے کے ساتھ ایک خاص سیاسی فکر بھی رکھتے تھے وہ جمعیۃ العلماء ہند کے صدر تھے اور آزادی کے بعد سابقہ روش کے برخلاف جمعیۃ العلماء ہند کانگریس کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوگئی تھی کہ دونوں کے سیاسی فکر میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا تھا۔

مولانا کے ان سیاسی افکار کا اثر دار العلوم کی فضاؤں میں صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اگرچہ سیاسی لائن کے آدمی نہ تھے، لیکن وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تعلق رکھتے تھے، ان کے خلیفہ بھی تھے۔ مولانا تھانوی جیسا کہ لوگ جانتے ہیں کانگریس اور نہرو گاندھیائی انداز سے کوئی زیادہ متفق نہ تھے۔

بہر حال حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور مولانا مدنی کے دینی اور سیاسی مذاق میں ایک فرق موجود تھا اور اسکے اثرات دار العلوم میں محسوس کئے جاتے

تھے. وہ بہت سے لوگ جو مولانا مدنی کے ہم خیال، انکے عقیدت مند بلکہ ان کی جماعت کے ساتھ تعلق رکھنے والے تھے. دارالعلوم کے کلیدی عہدوں پر فائز تھے. مثلاً تنظیم وترقی جو دارالعلوم کا ایک اہم شعبہ تھا اور اسی کے ذریعے دارالعلوم کی آواز پھیلتی تھی اس کے ناظم بجنور کے مولانا محمود گل تھے، جو مولانا مدنی سے بڑا گہرا تعلق رکھتے تھے. اسی طرح مولانا سلطان الحق دارالعلوم کے کتب خانے کے ناظم تھے اور یہ بھی سکہ بند مدنی پارٹی کے تھے. اسی طرح تعلیمات کی نظامت جو دارالعلوم کا سب سے اہم تعلیمی شعبہ ہے. اس پر بھی عام طور پر وہی لوگ رہتے رہے جن کا تعلق مولانا مدنی سے تھا. منشی عزیز احمد صاحب مع اپنے صاحبزادے محمد حسیب صدیقی کے اس جماعت سے وابستہ رہے.

ان دو فکری دھاروں کے باوجود حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ہمیشہ اعتدال، میانہ روی اور رواداری اختیار کی اور ان افکار وخیالات کو تنازعہ کا سبب نہیں بنایا.

یہ بات تسلیم کرنی چاہیئے کہ خود مولانا مدنیؒ بھی اپنی خاص سیاسی فکر کے باوجود صاحب علم بھی تھے اور صاحب دل بھی. یہ بات جانتے تھے کہ دارالعلوم کی بھلائی کیلئے اور اس کی ترقی کیلئے مولانا قاری طیب صاحب کا وجود کتنا اہم ہے.

چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ پاکستان گئے اور کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ انھوں نے وہیں مستقل قیام کا ارادہ کرلیا. مولانا مدنی کو اس سے بڑی تشویش ہوئی. قاری صاحبؒ کو پاکستان کی شہریت مل چکی تھی. قانونی طور پر اس کو ختم کرنا اور قاری صاحبؒ کو ہندوستان لانا بڑا مشکل کام تھا.

لیکن یہ مولانا مدنی تھے، رائے اور اختلاف کے باوجود دیانت داری کی بات یہ ہے کہ ان کی عظمت کو تسلیم کیا جائے. مولانا مدنی اپنی بے نیازانہ طبیعت کے باوجود خود جواہر لال نہرو کے پاس گئے جو اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم تھے. اس معاملے میں ان سے مداخلت کے لئے کہتے ہوئے ان کے الفاظ یہ تھے کہ میں اپنی زندگی بھر کی سیاسی خدمت کا یہ صلہ سمجھتا ہوں کہ آپ حضرت مولانا قاری محمد طیب کو

ہندوستان لے آئیں. چنانچہ وہ سب قانونی مرحلے طے ہوئے. قاری صاحب ہندوستان واپس تشریف لائے تو دیو بند کے اسٹیشن پر مولانا مدنی نے ان کا استقبال کرتے ہوئے بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو

تو کجا بہر تماشا می روی

یعنی لوگ تو خود تیرے دیدار کے لئے منتظر ہیں تو کہاں دیدار کرانے کیلئے جاتا ہے. فکری اختلاف کے باوجود ان دونوں بزرگوں کا یہ باہمی ربط وتعلق ان لوگوں کے لئے ایک سبق ہے جو چھوٹے موٹے اختلافات کو تخریب کاری کا ذریعہ بنالیتے ہیں.

کبھی کبھی دفتر اہتمام میں ان بزرگوں کی باہمی ملاقات اور چٹکلوں اور لطیفوں کا منظر جیسے نگاہوں میں گھومتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ دارالعلوم کے مفادات کو اور اس کی تعمیر وترقی کو سامنے رکھتے تھے اور اپنی سوچ کو اس میں حارج نہیں ہونے دیتے تھے.

وہ دور بھی بڑی خیر وبرکت کا تھا جس میں ان جیسی قابل قدر شخصیات دارالعلوم کی خدمت کے لئے موجود تھیں...... حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاوی منطق اور فلسفے کے امام مولانا اعزاز علی صاحب فقہ وادب کے ماہر مولانا بشیر صاحب علم ہیئت پر پوری دست گاہ رکھنے والے.

اسی طرح اور دوسرے قابل اساتذہ اور ماہرین فن...... ایسا لگتا تھا کہ یہ خوبصورت ہار ہے جس میں چمک دار ہیرے جگمگا رہے ہیں.

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ہمیشہ ان علماء اور ماہرین کی قدر و منزلت کی اور ان کو دارالعلوم کی آبرو اور اس کی عظمت کا نشان سمجھتے ہوئے ان لوگوں کا اکرام کیا.

غرض حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے پورے زمانۂ اہتمام میں جو تقریباً ساٹھ سال پر محیط ہے بہترین انتظامی صلاحیتوں کا ثبوت دیا.

(۱۰)

خطابت

خطابت وتقریر کی صلاحیت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ میں کمال کی تھی. ہر موضوع پر ہر طرح کے مجمع میں اس طرح خطاب کرنا کہ ان کی بات دلوں کو چھوتی ہوئی چلی جائے، ان کی تقریر کی قوتِ تاثیر کا نشان تھا مخالف سے مخالف بھی ان کے وعظ وتقریر سے متاثر ہوتا تھا.

لاہور کا ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب علماء دیوبند کے خلاف پروپیگنڈے سے بڑے متاثر تھے. علماء دیوبند سے برگشتہ اور طرح طرح کی بدعتوں میں مبتلا تھے. اتفاق سے قاری صاحبؒ لاہور گئے اور وہاں ایک مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان ہوا. یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ انکے وعظ میں اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا. اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کرونگا. ابھی تقریر بھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ اول تو حضرت قاری صاحب کا معصوم اور پرنور چہرہ دیکھ کر ان کے ارادوں میں زلزلہ سا آ گیا. دل نے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی گمراہ کا نہیں ہوسکتا. پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے حقائق اور معارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ علم دین کسے کہتے ہیں. وہ کہتے ہیں کہ تقریر کے ختم ہونے تک میں قاری صاحب کے آگے موم ہو چکا تھا. اپنے پچھلے خیالات سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں بدگمانیوں سے نجات عطا فرمادی.

برصغیر کا تو شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جہاں حضرت قاری صاحب کی آواز نہ پہنچی ہو. اس کے علاوہ افریقہ، یورپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا.

خطبات حکیم الاسلام کے نام سے انکے مواعظ وتقریر کی جو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور انکی تقریریں کیسٹ کی شکل میں بھی موجود ہیں، ان کو پڑھ کر اور سن کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قاری صاحب نے ہر موضوع پر کیسا خطاب کیا ہے.

(۱۱)

معصومیت

کہتے ہیں کہ چہرہ انسان کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے. حضرت قاری صاحبؒ کا چہرہ معصوم بھی تھا اور پرنور بھی. خدوخال باوقار، لب ولہجہ سبک جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں. چہرے کی طرح ان کا دل بھی ایسا معصوم تھا کہ جب انکو معلوم ہوتا تھا کہ فلاں صاحب نے ان سے آکر غلط بیانی کی ہے تو فرماتے تھے کہ مجھے یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ کوئی مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے. خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کبھی اپنے قلم سے کسی کو الگ نہیں کیا. شائستگی، شرافت، نرم روی اور سب سے بڑھ کر خداترسی جیسے انکے مزاج کا حصہ بن گئی تھی. وہ دوسروں کی تکلیف سے دکھی تو ہوتے تھے مگر خود کبھی دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے تھے.

☆☆☆

(۱۲)

عزمِ مستحکم

مزاج کی اس نرمی کے باوجود عزم کے بڑے پختہ اور استقامت کا پہاڑ تھے. انتہائی نازک موقعوں پر بھی راقم الحروف نے ان کو پر سکون ہی دیکھا.

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۸۰ء میں جب حضرت قاری صاحب مالیر کوٹلہ تشریف لائے میں نے درخواست کی اور اس کو آپ نے قبول فرمالیا. پورے پروگرام کے اشتہارات کی کتابت کرواکے میں دیوبند پہنچا تو دیکھا کہ دارالعلوم میں شورش کا آغاز ہو چکا ہے. یہ اسی شورش کا ایک سلسلہ تھا جس نے آخر سقوط دارالعلوم کی بدنما شکل اختیار کرلی اور جس حادثے سے آج بھی دل زخمی محسوس ہوتے ہیں.

احاطۂ دارالعلوم میں نعرے بازیاں ہورہی تھیں، میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے آپ کے پروگرام کے اشتہارات کتابت تو کروالئے ہیں ابھی چھپے نہیں ہیں اور یہاں حالات پراگندہ نظر آرہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ پروگرام منسوخ کرنا پڑے. حضرت قاری صاحب نے پورے اعتماد اور سکون سے فرمایا کہ نہیں. میں انشاء اللہ وقت پر پہنچوں گا تم اشتہارات چھپوالو. اس کے بعد دوسرے وقت میں پھر حاضر ہوا، اور میں نے کچھ شک کا اظہار کیا کہ پتہ نہیں حالات کیسے ہوں اور آپ تشریف لاسکیں کہ نہیں. حضرت قاری صاحب نے پورے سکون کے ساتھ فرمایا کہ نہیں میں پہلے ہی آجاؤں گا تم اشتہار چھپوالو اور اطمینان رکھو. چنانچہ یہی ہوا کہ حضرت مقررہ تاریخ سے پہلے ہی تشریف لائے اور کئی روز تک یہاں بڑے اطمینان کے ساتھ قیام فرمایا.

(۱۴)

ذاتِ بابرکت

حضرت قاری صاحب خوش صورت، خوش سیرت، بااخلاق، بامروت اور وضع دار ہونے کے علاوہ ان کی شخصیت بابرکت بھی تھی. اس کا تجربہ خود راقم الحروف کو ہوا کہ ان کے مبارک قدموں کی برکت نہ صرف دل نے محسوس کی بلکہ آنکھوں نے دیکھی. ان کی برکت کا پہلا تجربہ تو یہ ہوا کہ جب وہ میرے مکان پر تشریف لائے تو تقریباً دن کے گیارہ اور بارے بجے کے درمیان کا وقت تھا، حضرت کو لدھیانہ ہوتے ہوئے مالیر کوٹلہ پہنچنا تھا. لدھیانہ سے حضرت کے ہمراہ تین چار کاروں میں تقریباً تیس چالیس لوگ ہمراہ ہو گئے. گھر میں میں نے چند لوگوں کے کھانے کا انتظام کیا تھا اور یہاں تعداد کافی زیادہ ہو گئی تھی. حضرت نے تھوڑی دیر بیٹھ کر فرمایا کہ دلہن سے کہہ کر میرے لئے کھانا اتروادو. میں کھانا کھا کر آرام کر لونگا. میں نے حضرت کے لئے تو کھانا گھر کے اندر اتروایا اور باہر کے لئے جلدی جلدی سالن پکوانے کا انتظام کیا. میری اہلیہ کہنے لگیں کہ کھانا شروع کرادیں. جتنا موجود ہے اس کے علاوہ جلدی جلدی تیار ہو جائے گا اور میں روٹیوں کا تار ٹوٹنے نہیں دونگی.

آپ سچ مانئے کہ وہی کھانا جو چند آدمیوں کے لئے تھا میں نے حیرت سے یہ منظر آنکھوں سے دیکھا کہ وہ تھوڑا سا کھانا اتنے لوگوں نے خوب پیٹ بھر کر کھا لیا. ابھی دوسرے سالن کے تیار ہونے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ یہی کھانا سب کے لئے کافی ہو گیا.

حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکتوں کے واقعات پڑھتے چلے آئے تھے لیکن آج نائب رسول کی اس برکت کو گنہگار آنکھوں نے خود دیکھا کہ اللہ کے نیک بندوں کے قدموں میں بھی کیسی خیر و برکت ہوتی ہے. جہاں پڑتے ہیں وہ جگہ شاداب ہوتی چلی جاتی ہے.

- اس موقع پر یہ بات بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ میرے بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود جب کہ میں بھاگ دوڑ اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا جلسے کے نام پر مدد کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہی. یہاں تک کہ مجھے روپے گننے کی مہلت نہیں ملتی تھی اور میں نام لکھ کر لفافے میں پیسے ڈال دیتا تھا. کہ بعد میں حساب کتاب دیکھیں گے.
- ہوسکتا ہے کہ کچھ ذہنوں کو یہ برکت والی بات عجیب سی لگے مگر یہ حقیقت ہے کہ خیر و برکت کا ہونا قرآن و حدیث اور سیرت کے بہت سے واقعات سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے.

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر میں بیت اللحم میں بھی رکے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے کہنے پر آپ نے وہاں نماز بھی پڑھی. مسلم کتاب الایمان میں عتبان بن مالک کا واقعہ حضرت انسؓ نے بیان کیا ہے کہ وہ نگاہ سے معذور ہو گئے تھے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہلا کر بھیجا کہ کیا ہی اچھا ہو آپ تشریف لائیں اور میرے لئے اپنے نماز پڑھنے کی جگہ کو نشان مسجد بنادیں. چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب تشریف لائے اور آپ نے ان کے گھر میں ایک جگہ نماز پڑھی. فتح الباری شرح بخاری میں اس واقعہ کی پوری تفصیل موجود ہے. ملاحظہ ہو جلد اول صفحہ ۴۲۷ بحوالہ تفہیم المسلم جز ۳ کتاب الایمان.

مگر ظاہر ہے کہ اس میں اعتقاد یا عمل کے اعتبار سے غلو کرنا اور حد سے آگے بڑھ جانا بدعت کی حدوں میں داخل ہوتا ہے۔

بہرحال مقصد تو یہ ہے کہ جہاں تک خیر و برکت کا تعلق ہے وہ شخصیت میں، عمل میں، جگہ میں ایک جانی پہچانی بات ہے۔

حضرت قاری صاحب جس زمانے میں میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور مجھے ان کی میزبانی کی سعادت حاصل ہوئی اس وقت میرے مالی حالات اچھے خاصے تنگ رہتے تھے مگر ان کی تشریف آوری کے بعد ہی حالات میں خوش گوار تبدیلی کھلی آنکھوں سے نظر آنے لگی۔ حضرت والا نے بھی غیر معمولی شفقت اور محبت کا معاملہ فرمایا یہاں تک کہ خود میری سندیں منگوا کر تمام سندوں پر اپنے دستخط فرمائے۔ بہت دعائیں دیں اور ان کی دعاؤں کا اثر بھی ہر پہلو سے سامنے آیا۔

(۱۴)

ادبی مذاق

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا ادبی ذوق بھی بڑا نکھرا ہوا تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام بھی عرفان عارف کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۶۳ء کو علی گڑھ میں ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا۔ اس موقع پر "آنکھ کی کہانی" کے عنوان سے سینکڑوں اشعار بے تکلف ارشاد فرمائے۔ یہ صرف اشعار ہی نہیں ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اہل بصیرت کے لئے سامان بصیرت ہیں۔ اس میں آنکھ جیسی نعمت کے لئے اللہ کی شکر گذاری اور اس کی مدح و ثنا، آنکھ کی اہمیت، آنکھ کی

افادیت، پھر آنکھوں کی مختلف کیفیات ان کا کھلنا، ان کا نیم وا ہونا، آنکھوں کا پھرنا، آنکھوں میں شرم وحیا ہونا. یہ ڈھائی سو اشعار کی منظوم داستان انیس عنوانات پر مشتمل ہے. یہ مجموعہ جو ''آنکھ کی کہانی'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے. جب ملک کے مشہور نقاد صاحب طرز ادیب اور عالم دین صدق و سچ کے ایڈیٹر مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے پاس پہنچا تو انھوں نے حضرت مہتمم صاحب کے نام ایک مکتوب میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح فرمایا:

حضرت محترم السلام علیکم!

''آنکھ کی کہانی'' آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی. سبحان اللہ ماشاء اللہ! مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر و نظم پر بھی اس درجہ قدرت حاصل ہے. ذٰلک فضل اللہ.

کیا کیا قافئے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں. نہ کہیں جھول نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد بس آمد ہی آمد، خوش دماغ تو بہ حیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی، اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اسی درجہ میں ہیں. ماشاءاللہ.

دعا گو و دعا جو

عبد الماجد، ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۴ء

جناب افضل اقبال جو اس زمانے میں ہندوستان میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے انھوں نے اس نظم کو پڑھنے کے بعد مولانا طیب صاحب کے نام اپنے مکتوب میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''شعر کی سادگی، تخیل کی پرواز اور خلوص کی بہتات تمام ایسی خوبیاں ہیں جو آپ کی ذات سے نہایت آسانی سے منسوب ہوگئی ہیں. آپ کی روحانی عظمت کا تو

کون قائل نہیں، یہ مثنوی آپ کے ملکۂ شاعری کا لوہا ہم جیسے کافروں سے بھی منواتی ہے، بہت ظلم ہوگا اگر آپ اپنے مشاغل میں صنف شعر کی طرف توجہ نہ دے سکیں، اس ملک (ہندوستان) میں جہاں اسلام کو آپ کی ذات بابرکات سے تقویت پہنچتی ہے وہاں اردو بھی منت پذیر شانہ ہے"

⑮

تصانیف

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے انتظامی مصروفیات کے باوجود مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف فرمائی ہیں. بعض کتابیں مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض کتابیں ایسی ہیں جو ان کی تقریر کو مرتب کر کے کتاب کی صورت میں چھاپی گئی ہیں. ذیل میں ان کی تصانیف کی ایک فہرست پیش کی جارہی ہے. جس سے معلوم ہوگا کہ آپ کی تصانیف کا اچھا خاصا ذخیرہ مطبوعہ کتابوں کی صورت میں موجود ہے.

﴿۱﴾ تعلیمات اسلامی اور مسیحی اقدام.

یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی تھی. اس کا دوسرا ایڈیشن پاکستان میں بھی چھپا. اس کتاب میں عیسائیت اور یہودیت کی تعلیمات کا اسلام کی تعلیمات سے موازنہ کر کے اسلام کی حقانیت اور اس کی صداقت کو ثابت کیا گیا ہے. اس کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کی اسلام کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے. اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تہذیب اپنی چمک

دمک کے باوجود اندر سے کھوکھلی ہے. انسانیت کی نجات مغربی تہذیب میں نہیں بلکہ اس تہذیب میں ہے جس کی دعوت قرآن دیتا ہے. مولانا نے قرآن مجید کی آیتوں اور عقلی دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ انسانیت کو اپنی منزل پانے کے لئے اور اپنے مسائل کے حل کے لئے اسلام کے راستے پر چلنا چاہئے. کتاب سادہ اور عام فہم ہے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا کے لئے بھی بہت مفید ہے.

﴿۲﴾ اسلام کا اخلاقی نظام.

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اس کی اثر پذیری پر حکیمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے. یہ تحریر ایک پادری کے سوال کے جواب میں ہے جس میں اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ کرتے ہوئے اسلام کی اخلاقی برتری کو واضح کیا گیا ہے.

﴿۳﴾ التشبہ فی الاسلام.

اس کتاب کا دوسرا نام ''اسلامی تہذیب و تمدن'' بھی ہے. اس کتاب میں اسلامی تہذیب کے خدو خال واضح کرنے کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام نے دوسری تہذیبوں اور قوموں کے ساتھ مشابہت سے کیوں منع کیا ہے. اصل میں دوسری قوموں کے طور طریقوں اور اس کی تہذیب کو اپنانا احساس کمتری کی دلیل ہے اور جس قوم میں احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے وہ خود اعتمادی سے محروم ہو کر دوسری قوم میں جذب ہو جاتی ہے.

﴿۴﴾ اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں.

اس کتاب میں بنی اسرائیل کی تاریخ اور انسانیت کے خلاف ان کی سازشوں کو

قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے. یہ قوم بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے ہی اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف رہی ہے جس کی وجہ ان کا بغض وعناد اور کینہ ہے جو رسالت محمدیؐ کے دور سے صرف اس وجہ سے ہے کہ پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں کیوں مبعوث ہوئے.

﴿۵﴾ اصول دعوت اسلام.

اس کتاب کا اصل نام ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' ہے. یہ کتاب جنوری ۱۹۶۶ء میں مجلس معارف القرآن، دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی تھی. ۱۳۲ صفحات کی اس کتاب میں قرآن مجید کی سورہ نحل کی آیت اُدْعُـوْا اِلٰـی سَبِیْـلِ رَبِّکَ سے دس اصولِ دعوت اخذ کر کے ایک ایک اصول قرآنی پر جن کا تعلق دعوت وتبلیغ کے ساتھ ہے بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تصانیف میں یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود بڑی اہمیت رکھتی ہے.

اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعوت وتبلیغ کا اصل تعلق ان لوگوں سے ہے جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا. جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کی اصلاح کی جائے گی مگر اس کو دعوت وتبلیغ نہیں کہا جائے گا. اس کتاب سے ایک اقتباس جس سے حضرت قاری صاحب کی دین پر گہری نگاہ اور ان کی بصیرت اور حالات پر ان کی نظر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

:ایک غلطی کا ازالہ:

تبلیغ اسلام کے معنی پشتینی مسلمانوں کو عباداتی رنگ کے کچھ احکام پہنچا دینے اور انہیں وابستہ کر لینے کے نہیں ہیں کہ جس کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ فریضہ تبلیغ ادا ہو گیا یا اربابِ تبلیغ فرائض دعوت سے سبکدوش ہو گئے.

مجھے اس انداز کی کسی دعوتِ خاص کی ضرورت اور افادیت سے اگر چہ انکار نہیں لیکن فریضہ تبلیغ سے سبکدوشی سمجھ لیا جانا قرآن کے اصولِ تبلیغ کی روشنی میں یقیناً صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا یہ جزوی تبلیغ تذکیر و اصلاح وغیرہ کے عنوانات سے یاد کی جا سکتی ہے مگر عرفِ شریعت کے لحاظ سے اسے تبلیغ نہیں کہا جا سکتا اور توسعاً اگر کہا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ تبلیغ احکام کہا جا سکتا ہے (بشرطیکہ احکام و مسائل پہنچائے جائے) تبلیغِ اسلام نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ عرفِ شریعت میں تبلیغ درحقیقت اسلام پہنچانے اور اسلامی برادری کو وسیع کرنے کو کہا گیا ہے اس لئے تبلیغ اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے اسلام کا پیغام پہنچانے کا نام ہے.

(دینی دعوت کے قرآنی اصول صفحہ ۹،۱۰)

﴿٦﴾ انسانیت کا امتیاز.

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسانی کا اصل امتیاز کیا ہے. اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو شرف اور کرامت عطا کی ہے اور دوسری مخلوقات سے اس کا مرتبہ بلند کیا اس کی اصل وجہ کیا ہے.

﴿٧﴾ ایک قرآن.

برق جیلانی نے ایک کتاب لکھی جس کا نام دو قرآن ہے. اس میں اسلام کی بڑی گمراہ کن تشریح کی ہے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اس کا علمی جواب دیا اور بتایا کہ قرآن دو نہیں ایک ہی ہے اور یہ اپنے زمانۂ نزول سے لے کر آج تک جوں کا توں محفوظ ہے.

﴿۸﴾ حدیث رسول کا قرآنی معیار.

یہ بھی قاری صاحب کی بڑی اہم کتاب ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کے مقرر کردہ معیار کے مطابق حدیث رسول کا درجہ کیا ہے اور یہ شریعت کا قرآن کے بعد دوسرا ماخذ کیوں ہے. اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ حدیث دراصل قرآن ہی کی تفسیر و تشریح ہے. الگ سے کوئی چیز نہیں ہے.

﴿۹﴾ خاتم النبیین.

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں. حضرت قاری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ختم نبوت کو اس طرح سمجھایا ہے کہ قادیانی فتنے کا رد خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے.

﴿۱۰﴾ روایات الطیب.

اس کتاب میں وہ واقعات اور روایتیں جمع کر دی گئی ہیں جو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اپنے بزرگوں سے سنیں یا مختلف کتابوں میں درج تھیں.

﴿۱۱﴾ سائنس اور اسلام.

یہ کتاب اصل میں وہ معرکۃ الآرا تقریر ہے جو حضرت قاری صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وہاں کے اساتذہ اور طلبا کے سامنے کی تھی. اس میں بتایا گیا ہے اور بڑی بصیرت کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ سائنس کا اسلام کے ساتھ کوئی ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ سائنس اسلام کی حقانیت کو اور زیادہ علمی رنگ میں نکھار دیتی ہے.

﴿۱۲﴾ شانِ رسالت.

اس کتاب میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر اس طرح روشنی ڈالی

گئی ہے کہ آپ کی شان اور آپ کا عالی مرتبہ واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے.

﴿۱۳﴾ شہید کربلا و یزید.

محمود عباسی نے ایک زمانے میں خلافت معاویہ اور یزید کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں وہ موقف اختیار کیا جو تاریخ کا چہرہ بگاڑنے والا تھا...... اس پر مولانا مودودی کی کتاب خلافت وملوکیت سامنے آئی. اس میں ملوکیت کے نام پر صحابی رسول حضرت معاویہؓ پر بے جا تنقید کی گئی. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے شہید کربلا اور یزید میں اس سانحہ کے تعلق سے اہل سنت والجماعت کے حقیقی موقف پر روشنی ڈالی ہے.

﴿۱۴﴾ علم غیب.

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ علم غیب جو کسی کا دیا ہوا نہ ہو بلکہ خود بخود ہو وہ صرف اللہ کی صفت ہے جو کہ عالم الغیب ہے. مخلوق میں سے اگر کسی کو غیب کی کسی بات کا علم ہو تو وہ اللہ کا دیا ہوا ہے خود بخود حاصل نہیں ہوا ہے.

﴿۱۵﴾ علماء دیوبند کا دینی رخ اور ان کا مسلکی مزاج.

اس کتاب میں مسلک دیوبند پر اچھی طرح روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دین ایک ہے. مسلک مختلف ہو سکتے ہیں جن سے دین کی وحدت متاثر نہیں ہوتی. دعوت وتبلیغ دین کی ہوتی ہے مسلک کی نہیں ہوتی. علمائے دیوبند کا اعتدال اور جامعیت مزاج نبوت سے اس کا قرب فقہ حنفی پر ان کی گہری نظر اس کتاب میں یہ باتیں بڑی خوبی کے ساتھ سامنے آتی ہیں.

﴿۱۶﴾ مسلکِ علمائے دیوبند.

اس مختصر کتاب میں بھی علماء دیوبند کے مسلک پر اچھا کلام کیا گیا ہے.

﴿۱۷﴾ فلسفۂ نماز.

نماز کی حکمت، اس کی اہمیت اور دین میں اس کا مقام کیا ہے، یہ سب باتیں اس کتاب میں بڑے خوب صورت انداز میں بتائی گئی ہیں.

﴿۱۸﴾ کلمۂ طیبہ.

بمبئی کے ایک جرنلسٹ نے اپنے ایک مضمون میں کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اسلامی کلمہ ہونے سے انکار کر دیا اور پھر اخبار میں مسلسل مضامین لکھنے شروع کر دیئے. اہل بمبئی کی فرمائش پر اس فتنے کو دبانے کے لئے حضرت قاری صاحب نے کلمہ طیبہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں قرآن وحدیث، اجماع وقیاس تمام دلیلوں سے ثابت کیا کہ یہ اسلام کا کلمہ ہے. مختصر ہونے کے باوجود عوام اور خواص سب کے لئے بڑی مفید کتاب ہے.

﴿۱۹﴾ مقالاتِ طیبات.

مقالات طیبات مقالات یا طیبہ اس کتاب کے دو حصے ہیں. پہلے حصے میں یہ مقالات شامل ہیں. میلاد النبیؐ کی حقیقت، اردو کی شرعی حیثیت، تصویر اسلام کے آئینے میں. دوسرے حصہ میں یہ مقالے ہیں: ۱۸۵۷ء اور دارالعلوم دیوبند. تقریر علم و حکمت، کلماتِ طیبات. ۱۸۵۷ء اور دارالعلوم دیوبند کے نام سے ہندوستان کی تحریک آزادی پر روشنی ڈالی گئی ہے. یہ تقریر علم وحکمت اصل میں ایک وعظ ہے جو برہنپور میں کیا تھا. کلمات طیبات کے عنوان سے مریدین اور متعلقین کے لئے شجرۂ طیبہ یعنی ذکر

اللہ کے دس کلمے بتائے گئے ہیں.

﴿۲۰﴾ اسلامی آزادی.

اس کتاب میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے بتایا ہے کہ اسلام میں آزادی کا اصل مفہوم کیا ہے اور جب کسی قوم کو آزادی مل جاتی ہے تو اس پر کیا ذمہ داریاں آتی ہیں. ان باتوں کو قرآن وحدیث سے نکال کر ۲۲ر دفعات میں جمع کیا ہے.

﴿۲۱﴾ عالمی مذہب.

اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون سا مذہب ہے جو عالمی ہوسکتا ہے.

﴿۲۲﴾ مقاماتِ مقدسہ.

یہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی نہایت اہم تصنیف ہے. اس کا مسودہ موجود تھا لیکن اس کی طباعت ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی نے اپنے کتب خانہ قاسمی دیوبند سے کی ہے. اس میں مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، بیت المقدس اور دوسرے مقدس مقامات کی تاریخ ان کی فضیلت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے.

﴿۲۳﴾ خطبات حکیم الاسلام.

اس میں حضرت قاری صاحب کی تقریریں اور خطبات جمع کیے گئے ہیں. اب تک دس جلدیں شائع ہوچکی ہیں. عوام وخواص میں آپ کے خطبات کا مجموعہ نہایت مقبول ہے.

﴿۲۴﴾ ذکرِ طیب.

یہ حضرت قاری صاحب کی سوانح عمری ہے. جس کو حافظ محمد اکبر شاہ بخاری نے مرتب کیا ہے. ۱۹۸۹ء میں اس کا ایڈیشن دارالکتاب دیوبند سے شائع ہوا ہے. ۳۴۰ صفحات کی اس کتاب میں قاری صاحب کے تعلق سے مختلف مضامین ایک جگہ اکٹھے کر دیئے گئے ہیں جس سے آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے.

﴿۲۵﴾ نونیۃ الآحاد (عربی)

یہ عربی زبان میں لکھا ہوا ایک قصیدہ ہے. جس میں امت کے مشاہیر علم وفن کی مختصر سوانح نظم میں جمع کی ہیں.

﴿۲۶﴾ فلسفۂ نعمت ومصیبت.

اس کتاب میں حضرت قاری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں یہ بتایا ہے کہ جو ہمیں مصیبت نظر آتی ہے وہ بھی درحقیقت اپنے نتیجے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے.

﴿۲۷﴾ دارالعلوم کا فتویٰ اور اس کی حقیقت.

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے. ایک صاحب نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کی کتاب تصفیہ العقائد کی چند عبارتوں کو توڑ مروڑ کر ایک سوال کی صورت میں دارالعلوم دیوبند سے فتویٰ حاصل کیا. حضرت قاری صاحب نے اس فتوے پر اپنے مضمون میں بتایا کہ حقیقت کیا ہے. یہ رسالہ شعبۂ نشر واشاعت دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوا ہے.

﴿۲۸﴾ اسلام اور فرقہ واریت.

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے فرقہ واریت جڑ سے ختم کر کے ایک امت کا عالمی تصور پیش کیا ہے.

﴿۲۹﴾ سفرنامہ افغانستان.

۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں آپ نے افغانستان کا سفر کیا. یہ کتاب اسی سفر کی روئیداد ہے.

﴿۳۰﴾ عرفان عارف.

یہ آپ کے پاکیزہ کلام کا مجموعہ ہے جس میں حمد، نعت اور مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے.

دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی (استاد فقہ و حدیث جامعہ رحیمیہ دہلی) نے ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ہے "دنیاء اسلام کی چند عظیم شخصیتیں" اس کتاب کو شاہ ولی اللہ اکیڈمی میر درد روڈ نئی دہلی نے ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء میں شائع کیا ہے. اس کتاب کے ۱۲۸ صفحات ہیں. اس میں صفحہ ۴۴؍ سے ۵۱؍ تک حضرت قاری صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو جگمگاتے نظر آتے ہیں. قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

"متناسب بدن، پیرانہ سالی میں نحیف جسم، ماضی کے حسن و موزونیت کا غماز تھا، بڑی چمک دار روشن آنکھیں جن سے معصومیت و شرافت ٹپکتی اور جھلکتی تھی، کشادہ تاب ناک پیشانی جو علمی عظمت و جلالت کا نیر تاباں، تقدس مآب چہرہ، سفید متشرع داڑھی، مونچھوں کی تراش میں اتباع سنت کے ساتھ حسن ذوق کا اظہار، جسم پر صوفیانہ رنگ و انداز کی سادہ پرکار ڈھیلی ڈھالی شیروانی، سر پر اونچی دیوار کی دو پلی ٹوپی، گول

مہری کا پائجامہ، ایک ہاتھ میں عصاء، سنت پیغمبری اور دوسرے ہاتھ میں خوب صورت رنگ کا رومال، عصر حاضر میں اقوام و امم کا نفسیات شناس ترجمان اسلام شریعت کی حکمتوں اور دانائیوں کے موتی بکھیرنے والا مرد حق آگاہ، ولی اللّٰہی حکم و اسرار کا بلاشرکت غیر وارث، علوم قاسمی کا امین، میکدہ تھانوی کا آخری ساقی، حیدرآباد اسٹیٹ میں عہدۂ قضاء کے دارالمہام، فقیہ الاسلام مولانا الحافظ محمد احمد کا لخت جگر، اعلاء حکمت اللہ کی راہوں میں جہانیان جہاں گشت،

اس علمی خاکے میں جلوہ افروز ہونے والی (صرف عالم اسلام ہی کی نہیں بلکہ کل عالم انسانی کی مانی ہوئی) عظیم المرتبت اور یگانۂ روزگار جو عالمی شخصیت ہے وہ قطب ارشاد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قدس سرہٗ العزیز سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی گراں قدر ذات گرامی ہے جسے دیکھتے ہی آدمی بے ساختہ بول اٹھے ۔

اسلام کے پاکیزہ خوابوں کی حسین تعبیر ہے تو
ہونا ز مصور کو جس پر سچ ہے وہی تصویر ہے تو

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ان عالم گیر اور شہرۂ آفاق شخصیتوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی ''علمی و عملی زندگی'' میں حال و مستقبل کے لئے ایسے انمٹ نقوش اور لافانی خطوط چھوڑے ہیں جن کے لئے شخصیتیں بنتی نہیں بلکہ بنی بنائی بھیجی جاتی ہیں.

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ایک بات چپکے سے نہیں بلکہ بلاخوف تردید کہنے کے لائق ہے کہ اگر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سیاسی جھمیلوں و بکھیڑوں میں نہ پڑتے اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اہتمام دارالعلوم کی ذمہ داریوں اور الجھنوں میں نہ الجھائے گئے ہوتے تو یہ دونوں فخر روزگار اور شان ہندوستان شخصیتیں اپنے اپنے

وقت کے امام غزالی علامہ ابن تیمیہ اور شیخ تقی الدین بن دقیق العید کی ہم رتبہ ہوتیں. محترم جمیل مہدی دیوبندی ایڈیٹر عزائم نے کیا خوب طیب شناسی کا ثبوت دیا ہے. تحریر کرتے ہیں:

''محمد طیب ایک کوہِ نور کا نام تھا جو کسی کلاہ کج میں لگ جاتا تھا تو اسے علم وفضل کا بادشاہ بنا دیتا تھا.'' حکیم الاسلام غیر معمولی ذہانت وذکاوت، وسعت نظر، وسعت مطالعہ اور استحضار علم میں اپنی نظیر آپ تھے. قدرت نے آپ کو عجیب وغریب نکتہ رس، نکتہ آفریں اور متجسس ذہن ودماغ سے نوازا تھا. قرآن کریم کی وہی آیات صحاح کی وہی احادیث اور تاریخ وسیر کے وہی بیانات وواقعات ہم اور آپ بیسوں دفعہ اسٹڈی کرلیں اور ہمارا ذہن کسی خاص چیز کو نہ پاسکے لیکن حضرت ان ہی آیات واحادیث اور تاریخی واقعات سے ایسے نکات ولطائف اور حقائق ومعارف اخذ فرمالیتے تھے کہ ان کی اس نکتہ آفرینی بلند خیالی اور پرواز ذہنی پہ وہ بھی عش عش کرنے لگتے تھے جو اپنے آپ کو اس فن کا مخصص اور ماہر سمجھتے تھے اور فی الواقع تھے بھی.

حکیم الاسلام کا ذوق مطالعہ بہت بلند اور معیاری قسم کا تھا. موصوف عامیانہ کتابوں اور نقول واقتباسات کے اوپر اعتبار واکتفا کے قائل نہیں تھے. وہ ہمیشہ بلند پایہ کتابوں، علمی نوادرات اور اصل ماخذوں کا بڑی عرق ریزی وجان فشانی سے مطالعہ فرمایا کرتے تھے. اور ان کتابوں کی روح پر آگاہ ہوکر ہی دم لیتے تھے. راقم الحروف کو ان کا ذاتی کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے. یہ کتب خانہ بے شمار نادر ونایاب کتابوں کا خزانہ ہے.

ان ہی نایاب کتابوں میں سے مشہور امام شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی عظیم تصنیف ''فتوحات مکیہ'' کی ضخیم متعدد جلدیں ہیں جو کسی زمانہ میں حکیم الاسلام کے زیر مطالعہ رہ چکی ہیں. قابل ذکر بات یہ ہے کہ کوئی صفحہ ایسا نظر نہیں آیا جس پر حضرت حکیم الاسلام کا تشریحی اور تنقیدی نوٹ نہ ہو. حالاں کہ ماضی کے رندان میخانہ تصوف کا

فرمان مشہور تھا کہ اس کتاب کو سمجھنے سمجھانے والے زیر زمین اور دنیا سے عنقا ہو گئے ہیں. افسوس! اب اس میکدہ تصوف کا آخری رند بھی نہ رہا۔

افسوس تم کو میر سے صحبت نہ رہی

حکیم الاسلام انقلاب آفریں مصنف اور صاحب طرز انشاپرداز تھے. آپ اصلاً تصنیف وتالیف اور دینی وتعمیری کاموں ہی کے لئے پیدا کئے گئے تھے اور لکھنے پڑھنے کا بڑا صاف ستھرا ذوق و مذاق رکھتے تھے. آپ تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد دینی تحقیقی تصنیفات کے کامیاب ترین مصنف ہیں. آپ کی گرانقدر تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد آدمی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ اسرارِ شریعت اور روحِ دین کے راز داں و جانکار ہیں. آپ کی ہر بحث نہایت سنجیدہ، نہایت اصولی اور تشفی بخش اطمینان آفریں ہوتی ہے. اور ہر تصنیف آپ کی بالغ نظری، علمی گہرائی اور زبان و بیان کی سلاست کا حسین مرقعہ ہے. حالاں کہ آپ کی تصنیفات کی بڑی بھاری تعداد اثنائے سفر میں وجود میں آئی ہے.

حکیم الاسلام کے متعلق کسی کا یہ رائے قائم کر لینا کہ ان کے تمام خیالات و نظریات اور تحقیقات آپ کی تصنیفات میں مقید ہو گئے ہیں. یہ اس شخص کے ناآشنائے حقیقت ہونے کی واضح سند ہے.

حقیقت یہ ہے کہ حکیم الاسلام کے افکار و تحقیقات کے بہت کم حصے ان کی تصنیفات میں منتقل ہوئے ہیں. وہ بہت جانتے تھے ان کو فرصت نہ مل سکی ورنہ وہ گنجہائے گرانمایہ تھے. حکیم الاسلام سفر میں ہوں یا حضر میں ہر وقت آپ کا گوہر بار قلم رواں دواں اور جنبش میں رہتا تھا. آپ خوامخواہ بیکار بیٹھنا جانتے ہی نہ تھے. آپ کو بارہا دیکھا گیا کہ کوئی ہنگامی میٹنگ ہو یا کوئی تقریب آپ ایک گوشے میں خموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے صفحات لکھتے چلے جاتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ رات بھر ایک ہی پہلو پر بیٹھے لکھتے رہے.

حکیم الاسلام یگانہ روزگار خطیب اور نامور بلند پایہ سحر آفریں مقرر تھے. آپ کی حکیمانہ تقریریں بڑی پرکشش وہ پر تاثیر اور مدلل ہوا کرتی تھیں.

خطابت مولانا کا وہ خصوصی اور نمایاں وصف رہا ہے کہ جس میں آپ ہمیشہ ایک منفرد حیثیت کے حامل رہے اور آپ کے ہم عصروں میں سے کوئی شخص آپ کے اس انفرادی مقام میں شریک نہ بن سکا. سعید احمد اکبر آبادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ ''گھنٹوں بولتے تھے. زبان بڑی شگفتہ اور شائستہ، کہیں کہیں ظرافت اور مزاح آمیزی آواز از اول تا آخر یکساں نہ زیر و بم نہ اتار چڑھاؤ، مگر ساتھ ہی منطقی استدلال اور فلسفیانہ تشقیق اس لئے تقریر عوام و خواص دونوں کے کام کی. بات سے بات اور نکتہ در نکتہ پھر معلومات کی کثرت اور طبیعت کی روانی کا یہ عالم کہ کیا مجال ایک تقریر کا مضمون دوسری تقریر میں مکرر آ جائے. میرے نزدیک یہ سب کچھ فیضان حضرت نانوتویؒ اور حضرت تھانویؒ کا تھا. رحمہا اللہ.

دیوبند کے مشہور شاعر شمیم عثمانی نے کیا خوب کہا ہے ؎

تیری گفتار میں تھی جو ہر کردار کی آب
یاد آئے گا سدا ترا کہا ترے بعد

ہندو پاک کے مشہور شعلہ بیان خطیب رئیس الاحرار امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی فاضلانہ پر مغز تقریر سے متاثر ہو کر فرمایا تھا کہ ''ان کی ایک تقریر سے میری سال بھر کی سیکڑوں تقریریں تیار ہو جاتی ہیں.'' عصر کی نماز کے بعد طیب منزل میں ایک عرفانی نشست ہوتی تھی. جس میں علماء و طلبہ دار العلوم دیوبند اور عمائدین شہر پروانہ وار شریک ہوتے تھے اور آپ سے فقہی، تفسیری، حدیثی، کلامی، تصوفی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی و سائنسی مسائل کے حل دریافت کرتے اور آپ ان الجھے ہوئے اور پے چیدہ مسئلوں کو نہایت خوب صورتی اور خوش اسلوبی سے واضح فرماتے تھے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان مسئلوں میں کوئی

پیچیدگیاں تھیں ہی نہیں. بلکہ اکثر ایسی اصولی اور فنی بات بیان فرما دیتے کہ ایک ُت سے اس قسم کی بے شمار نئی باتیں ازخود برآمد ہونے لگتی تھیں. حکیم الاسلام اس علمی مجلس میں اکابرین کے پرتاثیر واقعات وحالات بڑے مزے لے کر سنایا کرتے تھے.

کاش! یہ تاریخی واقعات قلم بند کر لئے گئے ہوتے. چراغ دیوبند کا یہ آخری اجالا تھا. دارالعلوم کی سوسالہ زندگی کی بزم آرائیوں اور انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی. گوشان وشوکت کے سارے پچھلے نقوش مٹ چکے تھے. لیکن مٹے ہوئے رنگ و روغن میں بھی عہد ماضی کی تصویروں ومرقعوں کی بہار دیکھی جاسکتی تھی. راقم الحروف اپنی لاابالی طبیعت کی وجہ سے پابندی کے ساتھ اس ''بزم طیبی'' میں شریک نہیں ہوتا تھا. جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ نشست سیر وتفریح کے وقت میں ہوتی تھی. راقم الحروف بچپن ہی سے فٹ بال کا شوقین ہی نہیں بلکہ بدنامی کی حد تک مشہور تھا. پھر بھی راقم الحروف اور رفیق محترم مولانا شاہ جہاں قاسمی ہفتہ عشرہ میں دو تین بار ضرور ہی شریک ہوتے تھے اور یہ کیفیت لئے واپس ہوتے تھے ۔

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانہ سے

مولانا محمد شاہ جہاں چمپارنی ایک سیماب طبیعت جید الاستعداد نوجوان فاضل دارالعلوم دیوبند ہیں.

راقم الحروف نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے حجۃ البالغہ پڑھی ہے. آپ شیخ الاسلام امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حکم واسرار کے، مفکر اسلام مولانا عبید اللہ سندھی کے بعد سب سے بڑے ترجمان تھے. حکیم الاسلام کا حجۃ البالغہ کا درس دینے کا عجیب حکیمانہ انداز تھا.

حکیم الاسلام سیاسی ہنگاموں اور انتخابی نعرہ بازیوں کے لئے موزوں نہ تھے. جب کبھی حالات کے دباؤ یا کسی بزرگ کے سیاسی تصرف کی وجہ سے اس علمی دائرہ سے باہر قدم نکالا تو فوراً ان کو محسوس ہوا کہ یہ ان کا میدان نہیں ہے. البتہ ایک زمانے میں

جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے اپنے مزاج اور اپنے نظریہ سیاست کے خلاف معرکۃ الآرا اور فکر آفریں خطبات ضرور پڑھ چکے ہیں.

حکیم الاسلام مذہبی گروہ بندی اور جماعتی عصبیت کی مریضانہ ذہنیت سے بالکل پاک تھے. آپ کی مقناطیسی اور برگزیدہ شخصیت ۱۸ کروڑ مسلمانوں کے ان گنت فرقوں اور جماعتوں کے درمیان ایسی متوازن و معتدل اور غیر جانب دار رہی کہ ہر مکتب فکر کے افراد نے آپ کی بلند ظرفی، وسیع القلبی، وسیع النظری کی وجہ سے آپ پر پورا اعتماد و بھروسہ کیا اور اپنے لئے غیر مضر تصور کیا، حالاں کہ آپ کٹر دیوبندی ہی نہیں بلکہ نظریۂ دیوبندیت کے سب سے بڑے وکیل اور ترجمان تھے.

جب ۲۷/۲۸/ دسمبر ۱۹۷۲ء کو عروس البلاد بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا تاریخی اجلاس ہوا تو باتفاق آراء آپ ہی علماء اور دانشوران ہند کی اس عظیم تنظیم کے صدر اول بنائے گئے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اس منصب جلیل پر تاحیات فائز رہے اور مسلمانان ہند کی کشتی کی ناخدائی فرماتے رہے.

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا صحیح و جائز مقام کیا تھا. وہ ظالم تھے یا مظلوم یا ان کو ظالم کہنے والے خود ظالم تھے. اس کا فیصلہ اس ''دورِ کتمانِ حق'' میں نہ ہو سکے نہ سہی لیکن مستقبل کے مورخ کا بے لاگ و انصاف پسند قلم ان کی شخصیت پر سے جماعتی عصبیت اور تنگ نظری کے پڑے ہوئے دبیز پردے ضرور اٹھائے گا.

حکیم الاسلام آخر میں پنتھ ہسپتال میں مشہور اسپیشلسٹ ڈاکٹر خلیل اللہ صاحب کے زیر علاج تھے. ڈاکٹر خلیل اللہ صاحب نے کیا کچھ نہ کیا. راقم الحروف نے دیکھا کہ آپ ہر دم کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں. سر جھکائے ہوئے اور آنکھیں بند کئے ہوئے اور نہ جانے کس سوچ میں ڈوبے ہوئے. ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ کسی متاعِ گمشدہ کی تلاش میں ہیں. مگر جہاں کوئی علم و حکمت کی باتیں پوچھتا تو فوراً چہرہ پر بشاشت ظاہر ہو جاتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ دل کا ساز کسی نے چھیڑ دیا ہے.

راقم الحروف حسب معمول ایک دن حضرت کو دیکھنے کے لئے پنتھ ہسپتال گیا تو دیکھا کہ آپ ''تاریخ اندلس'' پڑھ رہے ہیں. مجھے بڑی حیرت ہوئی پھر خیال آیا کہ تسکین قلب کی خاطر تاریخ اندلس کا مطالعہ کرر ہے ہیں.

جس کا ڈر تھا وہ وقت آ گیا آخر

اچانک ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو ۱۲ر بجے دن میں جامعہ رحیمیہ میں یہ المناک خبر موصول ہوئی کہ حکیم الاسلام زبان حال سے کہتے ہوئے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

زمانہ برسرِ آزار تھا مگر فانیؔ
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

ملک و بیرون ملک کے ہزاروں لاکھوں عقیدت مندوں، نیاز مندوں، شاگردوں، عزیزوں یہاں تک کہ سیاسی حریفوں کو بھی تڑپتے ہوئے چھوڑ کر وہاں چل بسے جہاں سے واپسی نہیں ہوتی.

راقم الحروف کو یہ المناک حادثہ فاجعہ سن کر بہت صدمہ ہوا. بہت قلق ہوا. فوراً دہلی سے دیوبند کے لئے روانہ ہو گیا اور عالم تصور میں کھو کر مومن خان مومن مرحوم کا یہ شعر پڑھتا رہا۔

جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے
آ گیا تھا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل

راستے بھر ان کی معصوم صورت آنکھوں میں پھرتی رہی. دیوبند پہنچتے ہی طیب منزل میں حاضر ہوا. دیکھتا کیا ہوں حکیم الاسلام میٹھی نیند سو رہے ہیں. ایسا محسوس ہوا کہ آپ نے نصف صدی سے زائد نہ رکنے والی مشین کی طرح خدمت خلق، دعوت و عزیمت، تعلیم و تربیت، نظم و نسق، بیعت و ارشاد اور تصنیف و تالیف جیسے کارہائے نمایاں انجام دینے کے بعد اس طرح سکون پایا ہے جیسے رات بھر کا چلا اور جاگا ہوا مسافر صبح اپنی منزل پر پہونچ کر آرام کرتا ہے. یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی

آرام کیا.

حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی نماز جنازہ آپ کے حقیقی صاحب زادے خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہٗ نے انتہائی دل سوزی کے عالم میں پڑھائی تدفین کے بعد خاک پاک مزار قاسمی میں سوئے ہوئے منتخبین روزگار میں ایک عظیم شخصیت کے اضافے پر ہر زبان اس فطری سوال پر مجبور ہوگئی کہ ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

(۱٦)

جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا

اب ہم اس قصے کی طرف آنا چاہتے ہیں جو حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کا اور ان کی آخری عمر کا سب سے زیادہ دردناک المیہ ہے.

۲۱/۲۲/۲۳/مارچ ۱۹۸۰ء کو دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ جشن ہوا.۲۱/اکتوبر ۱۹۸۱ء کو دارالعلوم بند کرنا پڑا اور ۲۳/مارچ ۱۹۸۲ء کو مولانا اسعد مدنی کے گروپ نے دارالعلوم دیوبند پر اپنا قبضہ کرلیا.

دارالعلوم پر قبضہ ایک بڑے لمبے منصوبے کے ساتھ ہوا ہے.اس کا ایک خاص پس منظر ہے.جب تک وہ پس منظر سامنے نہ ہو قبضہ کی تصویر مکمل نہیں ہوتی ہفت روزہ عقائد دیوبند کے ۸/اگست ۱۹۷۲ء کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا.یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہفت روزہ عقائد دیوبند سے شائع ہونا شروع ہوا.۸/اگست کا یہ شمارہ

پہلے سال کا پہلا شمارہ تھا. اس پرچے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پہلا شمارہ چھپتے ہی چند دن میں ختم ہوگیا اور پھر اس کو دوبارہ تبارہ چھ ہزار کی تعداد میں چھاپنا پڑا. اس میں ایک مضمون اطہر عثمانی کے نام سے چھپا تھا. اس کا ایک حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''ابھی حال ہی میں دیوبند کے ایک خاص گروپ کی طرف سے عیدگاہ دیوبند کے انتظام پر قبضہ کرنے کی ایک بھونڈی کوشش کی گئی. واقعہ کی تفصیل سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ پورا پس منظر پڑھنے والوں کے سامنے آجائے تاکہ اس واقعہ کی صحیح تصویر اس کے پس منظر کے ساتھ دیکھی جاسکے.

دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہٗ کے بالکل آخیر دور میں دارالعلوم دیوبند کے اندر کچھ اس قسم کے واقعات رونما ہوئے کہ اس وقت کے شیخ الحدیث حضرت علامہ انورشاہ کشمیری نوراللہ مرقدہٗ کو دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی. یہ واقعہ دارالعلوم کی تاریخ میں ایک انتہائی نازک موقع تھا. جب مولانا انورشاہ کشمیریؒ کے ساتھ چند دیگر بزرگ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، اور دوسرے حضرات کو دارالعلوم سے تعلق ختم کرنا پڑا. مولانا انورشاہ کشمیریؒ کی خالی جگہ کو پُر کرنا آسان نہیں تھا. ان جیسا عالم فن حدیث کا امام اس وقت کوئی دوسرا نہیں تھا. مگر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بڑے فہیم و ذکی تھے. اور دارالعلوم کی خیرخواہی ان کا مقصد تھا. مولانا انورشاہ کشمیریؒ کی جگہ کے لئے انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۴۶ھ، ۱۹۲۷ء میں) کا انتخاب کیا اور ان کی علمی حیثیت کو ''شیخ العرب والعجم'' جیسے القاب سے اتنا نمایاں کیا کہ مولانا انورشاہ کشمیریؒ کی خالی جگہ کا احساس کم سے کم ہوسکے. مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے اور دارالعلوم کی ساکھ کا بروقت تحفظ کر گئے. مگر مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ اپنی علمی حیثیت کے ساتھ ساتھ سیاسی خیالات بھی رکھتے تھے. مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اس کے بعد کچھ زیادہ

دن حیات نہیں رہے. (۳/رجب ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء کو ان کی وفات ہوگئی) ان کے انتقال کے بعد مولانا مدنیؒ کے سیاسی خیالات کے اثرات کو سنبھالنے والا کوئی نہ رہا. مولانا مدنی کے مزاج میں شدت تھی. یہ شدت دینی امور میں بھی تھی احیائے سنت میں بھی تھی اور سیاسی خیالات ونظریات میں بھی یہ شدت نمایاں تھی.

مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کے انتقال کے بعد مولانا مدنیؒ کے سیاسی نظریات کا اثر دارالعلوم کی فضا میں نمایاں ہونے لگا.

اوراس طرح دارالعلوم سیاسی اعتبار سے دوحصوں میں تقسیم ہوگیا. موجودہ مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے ان کے گروپ کا اختلاف اسی سیاسی نظریات کی شدت کا اثر تھا. مگر چوں کہ مولانا عالم باعمل تھے اس لئے بات بہت کچھ بنی رہی، چنگاریاں دبی رہیں اور مولانا مدنی کی شخصیت کا بھاری پن ہر خلا کو ڈھانپے رہا اور مولانا محمد طیب کا تحمل ہر موڑ پر بات سنبھالتا رہا. ۱۵/دسمبر ۱۹۵۷ء، ۱۲/جمادی الاول ۱۳۷۷ء بروز جمعرات مولانا مدنی کا وصال ہوگیا.

حضرت مدنیؒ نے وصال کے بعد اپنے حلقہ اثر میں تین طرح کے لوگ چھوڑے:

(۱) وہ لوگ جو حضرت کے عقیدت مند مخلص تھے اور مخلصین کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے.

(۲) وہ حضرات جو سیاسی اعتبار سے حضرتؒ کے ہم خیال تھے.

(۳) وہ لوگ جن کے ذاتی مفادات وابستہ تھے.

ان تینوں قسم کے لوگوں کو بدستور آستانہ مدنی سے وابستہ رکھنے کے لئے کئی اقدام کئے گئے:

(۱) حضرتؒ کے خلفا کے ذریعہ حضرت مدنیؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا سید

اسعد مدنی کو حضرت کا جانشین بنایا گیا.

یہ اقدام جس انداز میں کیا گیا تصوف کی پوری تاریخ میں شاید اس کی مثال نہیں ملے گی.

خود مولانا مدنیؒ نے صاحب زادے کو اپنا خلیفہ یا جانشین نہیں بنایا بلکہ زندگی میں کسی نے ذکر بھی کیا تو ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور شیخ کے انتقال کے بعد کچھ خلفاؤں نے مل کر گویا شیخ کی مرضی کے خلاف ان کو شیخ کا جانشین بنا ڈالا. کچھ لوگوں نے اس حرکت کو پسند نہیں کیا مگر یا تو وہ خاموش رہے یا ان کی آواز اتنی کمزور رہی کہ بے اثر ہوگئی. بہر حال شیخ الاسلام کی منشا کے بالکل برخلاف مولانا سید اسعد مدنی ''جانشین شیخ الاسلام'' قرار دیئے گئے.

(۲) سیاسی پوزیشن بنانے کے لئے جمعیۃ علماء پر قبضہ کا منصوبہ تیار کیا گیا.

جمعیۃ العلماء پر قبضہ ہو جانے سے راجیہ سبھا تک پہنچنا آسان ہوگیا. یہ اس جانشین کا حال ہے جس کے والد نے حکومت کے خطاب پدم بھوشن کو بے نیازی سے ٹھکرا دیا تھا. (۱۳۷۴ھ، ۱۹۵۴ء) کرسی کے پیچھے یہ اس جانشین کی سرگردانی جس کے محترم باپ نے کبھی اپنی سیاسی خدمات کا کوئی صلہ نہیں چاہا. ذاتی مفاد رکھنے والے اگر چہ خوب ہاتھ دھو رہے تھے مگر ابھی ایک بات باقی تھی...... ابھی دار العلوم دیوبند پر قبضہ باقی تھا. ابھی وہ ادارہ باقی تھا جسکی مسند حدیث پر شیخ الاسلام درس دیتے تھے. جانشین محترم خود تو اس مسند کے لائق نہیں تھے. ابھی تک لکڑی کے پیر لگا لگا کر ان کا قد لمبا کیا گیا تھا. مگر اس مسند پر لکڑی کے پیر لگا کر نہیں چڑھا جا سکتا تھا کیوں کہ یہ مسند بہت اونچی تھی، کیوں کہ اس مسند کے تقاضے کچھ اور تھے اور جانشین محترم ان تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے.

اقتدار کی تصویر ابھی مکمل نہیں ہوئی، ابھی ایک رنگ اس میں باقی ہے. دار العلوم پر قبضہ کئی اعتبار سے ضروری ہے:

(۱) دارالعلوم کی بے داغ ساکھ کے بل بوتے پر حکومت سے سودا آسان ہے.

(۲) دارالعلوم سے فارغ ہونے والے طلبا کی کھیپ جمعیۃ العلماء کے لئے غذا کا کام دیتی ہے. جمعیۃ العلما کا چارہ اب صرف مدرسوں کے طلبا ہی رہ گئے ہیں.

کیوں کہ آج کی جمعیۃ مریدین کے ایک حلقہ میں محدود ہے کیوں کہ آج کی جمعیۃ کے پاس ایسی کوئی آواز نہیں ہے جس سے ہندوستان کے مسلمان آواز ملا سکیں، کیوں کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے بعد جمعیۃ میں اب مسلمانوں کے لئے کوئی کشش نہیں ہے.

(۳) دارالعلوم کے ملازمین میں جو لوگ وابستہ ہیں ان کے مفادات کے تحفظ کے لئے بھی دارالعلوم پر قبضہ ضروری ہے. اس دارالعلوم پر قبضہ کے لئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلیگئے. دہلی سے سفیروں وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو پکڑ پکڑ کر لایا گیا اور انہیں باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دارالعلوم کے کرتا دھرتا جو کچھ ہیں ہم ہیں. ارباب دارالعلوم پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی کہ اب مولانا اسعد میاں کا قد اتنا اونچا ہو گیا ہے کہ ایک جست میں پورے دارالعلوم پر قبضہ ہو سکتا ہے. اس دارالعلوم پر قبضہ کے لئے بار بار اسٹرائیکیں کرائی گئیں. مگر وائے ناکامی. اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا اقبال کہ ہر کوشش پاؤں کی زنجیر بنتی گئی.

منزل دور اور دور ہوتی گئی.

دارالعلوم پر تسلط بہر حال ضروری ہے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ بہت ضعیف ہوتے جا رہے ہیں. نہ جانے یہ چراغ کب گل ہو جائے. نہ جانے موت کے ہاتھ کب اس روشنی کو ڈھانپ لیں. آنے والے کل کا نقشہ کچھ اس طرح ہے:

(۱) دارالعلوم کی مسند صدارت پر وہ شخص آئے جو خالص اپنا ہو. مفتی محمود صاحب جیسے سادہ لوح حضرات اس کام کے لئے بہت موزوں ہو سکتے ہیں. ایسے شخص کے ذریعہ دارالعلوم کی تعلیمات پر اپنا قبضہ رہ سکتا ہے.

(۲) حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے بعد دفتر اہتمام بھی اپنے تصرف میں ہو. دارالعلوم پر تسلط کے لئے اہل شہر کا تعاون بھی ضروری ہے ورنہ یہ لوگ عین وقت پر گڑ بڑ پھیلا دیتے ہیں.

خاندان قاسمی کو ہر طرح سے باندھنے کیلئے شہر کا ساتھ لازمی ہے تا کہ اندر اور باہر کوئی آواز اٹھانے والا نہ مل سکے.

شہر والوں پر اپنے اثرات قائم رکھنے کے لئے ایک تو مسلم فنڈ ہے جس سے شہر والوں کی خاصی ضرورتیں وابستہ رہتی ہیں مگر صرف مسلم فنڈ یہ رول اس لئے ادا نہیں کر سکتا کہ اس کا حلقہ محدود ہے. مذہبی انداز میں تسلط عقیدت مندی کے قیام کیلئے مناسب ہو سکتا ہے. اور عقیدت ہی وہ ہتھیار ہے جو عوام کو اندھا اور بہرا اور گونگا بنا دیتا ہے. اس کے لئے عیدگاہ، جامع مسجد اور دوسرے مذہبی مرکز بہت کام دے سکتے ہیں.

(۱۷)

دارالعلوم دیوبند اور مولانا قاری طیب صاحب کی شخصیت کی تعمیر

دارالعلوم پر قبضہ کی کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے میں چند اور باتیں بھی اپنے قارئین کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں.

کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ بھی بتا دوں کہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی (مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ) میرے حقیقی دادا تھے. دارالعلوم دیوبند کے چھٹے مہتمم

ان کے حقیقی چھوٹے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب تھے. اور یہ میرے پر دادا مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے بیٹے تھے. جن کا شمار دارالعلوم کے اولین معماروں میں ہوتا ہے.

دارالعلوم دیوبند کو مرکزی حیثیت دینے میں اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تربیت، تعلیم اور شخصیت کی تعمیر میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے...... مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نہایت ذہین، ذکی اور نفیس الطبع انسان تھے. وہ غیر معمولی بیدار مغز، صاحب بصیرت تھے. وہ صاحب دل بھی تھے اور صاحب دماغ بھی. حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت تھے. متبع شریعت، صاحب تقویٰ یوں کہئے کہ روشن فکر اور روشن دل. ایسے لوگ کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں.

مولانا محمد احمد صاحب سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا بہت گہرا تعلق تھا. مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے دل میں پورے خاندان قاسمی کی جو محبت و عظمت رچی بسی تھی اس کا پورا رخ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی طرف ہو گیا. دارالعلوم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا اوڑھنا بچھونا تھا. شب و روز وہیں رہتے تھے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے. ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی. بس جو کچھ بھی تھے حضرت قاری صاحب ہی تھے. اور دارالعلوم دیوبند تھا. انھوں نے اپنے خون جگر سے دارالعلوم کو سینچا. جہاں کوئی قابل شخصیت نظر آئی اس کو نگینہ کی طرح دارالعلوم کی انگوٹھی میں جڑ دیا. اور اس طرح دارالعلوم علوم دینیہ کا مرکز بن گیا.

مولانا حبیب الرحمٰن کیا تھے کیسے تھے...... مولانا منظور نعمانی سے سنئے:

"راقم سطور شوال ۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء میں جب ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا تو اگر چہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کو

اس وقت کاغذات میں ''نائب مہتمم دارالعلوم'' دیو بند ہی لکھا جاتا تھا اور ضابطہ میں انکا عہدہ اور منصب یہی تھا لیکن فی الحقیقت وہی مہتمم تھے. حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ جو عہدہ کے لحاظ سے اصل مہتمم تھے. کچھ مدت پہلے سے ''مرحوم ریاست حیدرآباد'' کے ''مفتی عدالت عالیہ'' کا منصب قبول فرما چکے تھے اور اسکی وجہ سے وہیں قیام فرماتے تھے بلکہ کہا جاتا تھا کہ حضرت حافظ صاحب کے حیدرآباد تشریف لے جانے سے پہلے بھی اہتمام سے متعلق کاموں کا زیادہ تعلق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی سے رہتا تھا. غالباً اس میں اسکو بھی دخل تھا کہ دونوں حضرات میں ایسا تعلق تھا کہ دوئی کا احساس ہی نہیں تھا.

ایک دفعہ دارالعلوم کی میری طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں اپنے کو دارالعلوم کا نائب مہتمم کہتا اور لکھتا ہوں لیکن واقعہ یوں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجھے اس خدمت کے لئے مامور اور مقرر کیا تھا تو مجھے ''نائب مہتمم'' نہیں بلکہ ''مہتمم ثانی'' بنایا تھا.

بہر حال ہر قسم کی ذمہ داری اور عمل و دخل کے لحاظ سے وہی اس وقت دارالعلوم کے مہتمم تھے اور حق یہ ہے کہ مثالی مہتمم تھے...... ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف دارالعلوم ہی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مصرف اور موضوع بنالیا تھا. اہل و عیال کے جھمیلوں سے بھی اللہ نے آزاد رکھا تھا. بس اپنی اکیلی زندگی تھی. دارالعلوم کا دارالاہتمام (یا دفتر اہتمام) ہی ان کا مسکن تھا. اسی کے ایک کونے میں پلنگ پر ان کا بستر لگا رہتا تھا...... دیکھنے میں نہایت ضعیف اور منحنی تھے. معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھی اور سوکھی ہڈیوں کا ایک کشیدہ قامت ڈھانچہ ہے جس پر کھال منڈھی ہوئی ہے، مگر آنکھوں میں غیر معمولی قسم کی ایک چمک تھی. چلتے پھرتے ہمیشہ تسبیح ہاتھ میں رہتی لب متحرک ...... لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطْباً مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ کی تصویر نظر آتی.

مشہور تھا کہ غذا برائے نام ہی ہوتی ہے. بس چائے اور دواؤں پر گزارا ہے.

سنتے تھے کہ چائے بہت اعلیٰ قسم کی استعمال ہوتی ہے. ذوق نہایت لطیف ہے، دودھ بھی پیالی میں چھلنی سے چھان کر ڈالا جاتا ہے کہ بالائی کا کوئی ریشہ نہ آ جائے. کیا عجب کہ ذوق کی یہ لطافت اپنے مرشد گنگوہیؒ کی خدمت کی برکات میں سے ہو...... میں نے کئی بزرگوں سے یہ واقعہ سنا ہے کہ یہی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب ایک زمانہ میں حضرت گنگوہیؒ کے ہاں خادمانہ طور پر مقیم تھے، تہجد کے وقت حضرت کے لئے چائے تیار کرنے اور پلانے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی تھی، ایک رات کو چائے تیار کر کے حضرت کو پیش کی. حضرت نے چائے پینا شروع کی اور فرمایا، مولوی حبیب! آج چائے میں کچے پانی کا اثر ہے...... اگلے دن انھوں نے چائے کے تیار کرنے میں خاص احتیاط کی، کیتلی کو پہلے کھولتے ہوئے پانی سے گرم کیا اس کے بعد اس میں چائے بنائی پھر پیالی تیار کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کی، حضرت نے پیالی منھ سے لگائی اور فرمایا مولوی حبیب آج بھی کچے پانی کا کچھ اثر ہے، انہیں سخت ندامت ہوئی اور تعجب بھی ہوا...... اگلی رات کو انھوں نے پھر بہت احتیاط اور اہتمام سے چائے تیار کی اور مزید یہ کیا کہ پیالی کو دھو کر پہلے تولیہ سے خشک کیا، اس کے بعد اس میں چائے بنا کر حضرت کی خدمت میں پیش کی، حضرت نے چائے پی اور فرمایا. مولوی حبیب! آج کچے پانی کا وہ اثر نہیں ہے.

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی لطافت مزاج کے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کی طرح اس طرح کے بہت سے قصے مشہور ہیں، تو ممکن ہے کہ چائے کے بارے میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے ذوق و مزاج کی لطافت قیام گنگوہ کی برکات میں سے ہو.

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ بہت ہی ضعیف اور منحنی تھے، ان کے دبلے پتلے اور سوکھے جسم کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ ان کی رگوں میں خون بس برائے نام ہی ہوگا. مگر اس حالت میں بھی کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کسی

ضرورت سے دارالاہتمام کی طرف سے گزرنا ہوتا حضرت مولانا کو کام ہی میں مصروف ومنہمک دیکھا جاتا.

اللہ تعالیٰ نے بڑا ہی تیقظ دیا تھا. اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دارالعلوم کے ہر گوشے اور شعبے کی خبر رکھتے تھے، سب بڑوں اور چھوٹوں پر ان کا غیر معمولی اثر اور بڑا رعب تھا ...... طلبہ کے ساتھ ان کا رویہ بڑا ہی مشفقانہ تھا، جو طالب علم اپنی کوئی ضرورت لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، پوری توجہ اور ہمدردی سے اس کی بات سنتے اور چاہے اس بیچارہ کا کام بالکل نہ ہو پاتا لیکن وہ یہی احساس اور تاثر لے کر واپس آتا کہ مجھ پر حضرت مہتمم صاحب کی خاص نظر عنایت ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ خاص کمال حضرت ممدوح کو عطا فرمایا تھا...... خود اپنا ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دو سال دارالعلوم میں رہا (میرا قیام چند اور طلبہ کے ساتھ دارالعلوم سے باہر مطبع قاسمی کے ایک خستہ سے کمرے میں تھا) میری برابر یہ خواہش اور کوشش رہی کہ دارالعلوم کے احاطہ کے اندر کسی مناسب حجرہ میں قیام کی جگہ مل جائے، کئی دفعہ حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں درخواست لے کر حاضر ہوا. خوب یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ اس ضرورت سے حاضری ہوئی اور درخواست پیش کی، حضرت ممدوح نے بڑی ہمدردی اور شفقت کا معاملہ فرمایا، درخواست پڑھ کر فوراً اس پر کچھ لکھا اور اپنے پیش کار مولوی عبدالاحد صاحب کو (جو برابر کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے) خود بلند آواز سے پکارا...... مولوی عبدالاحد! وہ فوراً حاضر ہوئے، میری طرف اور میری درخواست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے فرمایا "یہ حجرہ کے لئے مولوی صاحب کی درخواست ہے، اس کو اپنے پاس رکھئے او جب بھی کوئی مناسب جگہ خالی ہو پہلے مولوی صاحب کو دی جائے." میں مطمئن بلکہ خوش ہو کر واپس آ گیا. لیکن جب دو تین مہینہ تک کوئی انتظام نہیں ہوا تو پھر دوسری درخواست لے کر حاضر ہوا. حضرت مہتمم صاحب نے پھر ویسی ہی شفقت کا معاملہ فرمایا، پھر اسی طرح پیش کار مولوی عبدالاحد

صاحب کو خود ہی پکار کے بلایا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے فرمایا کہ ''بھائی مولوی صاحب کی درخواست پہلے بھی آئی تھی، آپ کیلئے ابھی تک حجرہ کا انتظام نہیں ہو سکا؟...... انھوں نے اپنے خاص انداز میں عرض کیا کہ'' حضرت ابھی تک کوئی اچھی جگہ خالی نہیں ہوئی''...... حضرت مہتمم صاحب نے پھر فرمایا کہ'' بھائی خیال رکھنا چاہئے اور جب بھی کوئی مناسب جگہ نکلے مولوی صاحب کو پہلے دینا چاہئے...... اور میری دوسری درخواست بھی کچھ لکھ کر مولوی عبدالاحد صاحب کے حوالہ کر دی گئی، میں پھر مطمئن ہو کر واپس آ گیا اور میرے دل نے پوری طرح محسوس کیا کہ حضرت مہتمم صاحب کو میرا بڑا خیال ہے اور مجھ پر خاص نظر عنایت ہے اور اب تک مجھے حجرہ نہ مل سکنے کا خود ان کو بھی رنج اور قلق ہے.

دارالعلوم کے دو سالہ قیام میں کم از کم ۳؍۴؍ دفعہ اس طرح درخواست لے کر حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضری کی نوبت ضرور آئی تھی، اگرچہ نتیجہ یہ رہا کہ اپنے قیام کے آخری دن تک بھی مجھے دارالعلوم کے احاطہ میں جگہ نہیں مل سکی لیکن یہ خیال مجھے کبھی نہ ہوا کہ حضرت مہتمم صاحب نے بے توجہی برتی، بلکہ میرا تاثر ہر دفعہ یہی رہا کہ ان کو تو میرے ساتھ بڑی ہمدردی اور بڑی مربیانہ فکر ہے. لیکن اتفاق سے کوئی جگہ ہی نہیں نکل سکی، یا نیچے کے حضرات نے دوسرے لوگوں کو ترجیح دی اور میں محروم رہا.

بہرحال حضرت مہتمم صاحب کا رویہ اس قدر مشفقانہ تھا کہ انکی طرف سے دل میں شکایت کی کبھی لہر بھی نہیں پیدا ہوئی.

ایک دفعہ طلبہ میں دارالعلوم کے بعض انتظامی کارکنوں کے کسی نامناسب طرز عمل سے برافروختگی پیدا ہوئی، لیڈرانہ مزاج رکھنے والے کچھ طالب علموں نے اس کو ایک احتجاجی تحریک کی شکل دینے کی کوشش شروع کی. حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے طلبہ کو جمع کر کے خطاب فرمایا. ان کی اس تقریر کے یہ الفاظ اب تک

میرے کانوں میں گونج رہے ہیں:

''سن لو! تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں. تم ہی میری اولاد ہو، تمہارے ہی ساتھ جی رہا ہوں، انشاء اللہ تمہارے ہی درمیان رہتے ہوئے مرونگا تم ہی میری تجہیز و تکفین کروگے. تم ہی میری نماز جنازہ پڑھوگے، تم ہی مجھے دفن کروگے.''

اس طرح اپنا کے خطاب کرنے کے بعد تنبیہ بھی خوب فرمائی...... اس وقت بالکل ایسا محسوس ہوا کہ شاید سب کے دلوں کا غسل ہوگیا.

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کوئی رسمی اور روایتی قسم کے واعظ اور خطیب نہیں تھے لیکن بڑی ٹھوس، مدلل اور دل نشین تقریر فرماتے تھے. میں نے ان سے بہتر کسی سے مسلک جماعت دیوبند کی ترجمانی نہیں سنی.

میری طالب علمی کے آخری سال میں پنجاب سے ایک بہت بڑے پیر صاحب جو ایک ایسی درس گاہ کے صاحب سجادہ تھے جس کا حلقہ اثر وعقیدت وہاں کی درگاہوں اور گدیوں میں غالباً سب سے زیادہ وسیع ہوگا، دارالعلوم تشریف لائے. یہ پیر صاحب پنجاب کے اکثر سجادہ نشینوں کی طرح بے علم نہیں تھے. بلکہ صاحب علم تھے لیکن اندازہ کیا جاتا تھا کہ اگر چہ ان کے دل میں اکابر علماء دیوبند کا احترام ہے اور وہ بریلوی ذہن کے قطعاً نہیں ہیں تاہم کسی نہ کسی درجہ میں جماعت دیوبند کے بارہ میں اس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں جن میں ناخدا ترس مخالفین کے پروپیگنڈہ سے بہت سے ناواقف مخلص حضرات بھی مبتلا ہو جاتے ہیں...... دو تین دن ان کا قیام دارالعلوم میں رہا. ایک دن غالباً ان کے بعض رفقاء کی یہ خواہش معلوم ہونے پر کہ وہ یہاں کے حضرات اکابر سے کچھ سننا اور مستفید ہونا چاہتے ہیں. حضرت پیر صاحب کے اعزاز و اکرام میں دارالعلوم کی طرف سے ایک خاص جلسہ ہوا اس میں حضرت الاستاذ العلامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا سید محمد مرتضٰی حسن صاحب چاند پوری نے بھی

خطاب فرمایا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے مدلل انداز میں اور بڑے مؤثر و دلنشین طریقہ پر اپنے اکابر کے مسلک و مشرب کی وضاحت فرمائی۔

جہاں تک یاد رہ گیا ہے اس کا حاصل اور خلاصہ یہ تھا کہ...... ہم اور ہمارے اکابر عقائد اور اصول میں طریقہ اہل السنۃ والجماعۃ کی متبع ہیں اور پوری طرح مطمئن ہیں کہ وہی طریقہ **ما انا علیہ و اصحابی** کا مصداق ہے۔

فروع میں ہم پوری بصیرت کے ساتھ فقہ حنفی کا اتباع کرتے ہیں اور اتباع ہویٰ اور **اعجاب کل ذی رأی برأیہ** کے اس دور میں عام امت کے دین کی حفاظت کے لئے اور فتنوں سے ان کو بچانے کے لئے ائمہ کی تقلید شخصی کو ہم پورے شرح صدر کے ساتھ ضروری سمجھتے ہیں۔

اور حضرات صوفیاء کرام کی نسبت احسانی اور تزکیۂ اخلاق کو ہم روحِ دین سمجھتے ہیں۔

ان تینوں اصولی باتوں پر حضرت مہتمم صاحب نے پوری تفصیل اور بھرپور استدلال کے ساتھ روشنی ڈالی تھی۔ خاص کر تقلید شخصی کے بارہ میں جو کچھ اس تقریر میں فرمایا تھا وہ بہت ہی بصیرت افروز اور اطمینان بخش تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر آج تک بھی میں نے ایسی اطمینان بخش نہ کوئی تحریر پڑھی نہ کسی کی تقریر سنی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دور میں صرف دار العلوم کے مہتمم اور انتظامی افسر ہی نہیں تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پوری جماعت کے زعیم و قائد، ترجمان اور گویا غیر رسمی امیر کا مقام بھی ان کو حاصل تھا۔ ہر اہم معاملہ میں وہی پالیسی طے فرماتے تھے، ان کو اطمینان رہتا تھا کہ پوری جماعت دار العلوم میرے ساتھ ہے اور یہ اطمینان برحق ہوتا تھا...... مگر افسوس ہے کہ آخری دور میں جماعت کی وحدت اور

یگانگت کونظر لگ گئی، باہمی اعتماد واتحاد کی خاص برکات اٹھ گئیں اوران کی جگہ اختلاف وانتشار کے نامبارک اثرات نے لے لی، اور جب صحابۂ کرام کی مقدس، جماعت بھی نزاع باہمی کے خداوندی امتحان سے نہ بچ سکی تو کون طبقہ اور کون گروہ ہوسکتا ہے جو اس ابتلاء اور امتحان سے ہمیشہ محفوظ رہنے کا استحقاق رکھتا ہو. **یفعل اللّٰہ ما یشاء ویحکم مایرید.**

۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی وفات کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عہدہ اور منصب کے لحاظ سے بھی دارالعلوم کے مہتمم قرار پائے گئے تھے. لیکن اس کے بعد صرف ایک سال کے قریب حیات رہے اور ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء میں وفات پاگئے.

رحمہ اللّٰہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین.

(تحدیث نعمت از صفحہ ۱۳۱ تا ۱۳۸)

بہر حال مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنے خاص ذوق کے مطابق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تربیت کی اوراس کے نتیجے میں حضرت قاری صاحب دارالعلوم دیوبند کو چلانے کے ہر طرح سے اہل ہوگئے. دارالعلوم ان کے مذاق میں رچ بس گیا اور دین کی اس خدمت کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا. نہ دارالعلوم روز روز بنتا ہے اور نہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسے لوگ جلدی سے پیدا ہوتے ہیں. یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک طالع آزماقسم کے شخص نے جس کی اپنی صلاحیتیں بس جوڑتوڑ تک محدود رہی ہیں پورے دارالعلوم کی تاریخ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا.

میرے کانوں میں آج بھی مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے وہ درد بھرے الفاظ گونج رہے ہیں جو انھوں نے میری بیٹی لبنیٰ خاتون کے نکاح کے موقع پر دیوبند میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے. اس تقریب میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

بھی تشریف فرما تھے. دارالعلوم میں شورش سر اٹھانے لگی تھی. یہ ۱۲/اکتوبر ۱۹۸۱ء (۱۳/ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ) کی بات ہے. مفتی صاحب نے بڑے پردرد الفاظ میں فرمایا تھا کہ ہمہ وقت ساتھ رہنے میں صحیح اندازہ نہیں ہوتا. قاری صاحب کی شخصیت ہمارے لئے بہت بڑی نعمت ہے، نہ صرف ہمارے لئے بلکہ دارالعلوم کے لئے بلکہ ملت اسلامیہ کے لئے، اس وقت کچھ آزمائش بھی چل رہی ہے. ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ دارالعلوم کے لئے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا وجود کس درجہ اہمیت رکھتا ہے یہ تقریراور مولانا طیب صاحب کا خطاب جوانھوں نے اس موقع پر فرمایا تھا. اس کا ٹیپ بھی میرے پاس محفوظ ہے جوایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے.

۲۳/مارچ ۱۹۸۲ء کی شب میں جو کچھ ہوا وہ صرف ایک شخص کا چلا جانا اور دوسرے شخص کا آجانا نہیں ہے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو بھی آخر ایک دن دنیا سے رخصت ہونا تھااور دارالعلوم میں ان کے بعد ان کے جانشین کو آنا تھا...... یہ ایک شخصیت کی بات نہیں ہے...... یہ ایک ادارے کے ایک خاص ذوق، مزاج اور اس کے اندازنظر کی بات ہے. جس نے مشکل سے مشکل حالات میں اسلام کی شمع کو روشن رکھا......

بات ذرا کھل کر ہو جائے اس کے لئے ایک واقعہ سامنے رکھئے......اس واقعہ کا راوی خود راقم الحروف ہے...... حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے خود یہ واقعہ مجھے سنایا تھا......

دارالعلوم دیوبند کا مزاج ہمیشہ اعتدال اور رواداری کا رہا ہے. اس نے ہمیشہ ملت کی ہیئت اجتماعیہ کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے. اگر چہ خود دارالعلوم کا مسلک حنفی ہے مگر دوسرے تمام مسلکوں کا احترام، مسلمانوں کے تمام طبقوں کا اکرام اور اختلاف کے باوجود ایتلاف سب کو جوڑ کر چلنا یہ دارالعلوم کا خاص ذوق اور مزاج و مشرب رہا ہے. یہی وجہ ہے کہ قادیانی جماعت پر کفر کا فتویٰ لگانے کا بہت غور و فکر کے بعد اور پوری

چھان بین کے بعد فیصلہ کیا گیا. اور پھر جب یہ فیصلہ ہوگیا تو اس فتنے کا مقابلہ بھی پورے حوصلے اور علمی مزاج کے ساتھ کیا گیا.

مولانا احمد رضا خان صاحب کے بریلوی مسلک کے تعلق سے اگرچہ کئی چیزوں میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے اور بریلوی مسلک کے لوگ دارالعلوم دیوبند کے اکابر پر کھلم کھلا کفر کے فتوے جڑتے رہے ہیں مگر دارالعلوم کے اکابر نے ان پر کبھی کفر کے فتوے نہیں لگائے اور ان کے ساتھ اختلاف کو علمی دائرے کے اندر ہی رکھا...... یہی انداز نظر دوسرے مسلکوں کے بارے میں بھی رہا مگر جماعت اسلامی کے تعلق سے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی وجہ سے خاصا سخت رویہ اختیار کیا گیا.

مجھے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے واقعہ سنایا کہ حضرت مدنیؒ نے جماعت اسلامی کے خلاف ایک کتاب لکھی اور اس کو میرے پاس لے کر آئے اور فرمایا کہ تم اس کو پڑھو اس پر اپنا مقدمہ بھی لکھو اور اس کو دارالعلوم دیوبند کی طرف سے شائع بھی کرو. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے فرمایا کہ جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو اس کا لب ولہجہ اور انداز تحریر اتنا متشددانہ تھا کہ اس کو شائع کرنا مناسب نہیں تھا. میں نے اس کو پڑھ کر حفاظت کے ساتھ ایک جگہ رکھ دیا اور کئی مرتبہ مولانا مدنی کے اصرار اور یاددہانی کے باوجود میں مختلف حیلوں سے اس کو ٹالتا رہا اور آخر کار میں نے اس کو منظر عام پر نہیں آنے دیا. جماعت اسلامی کے ساتھ اس طرح کی محاذ آرائی قاری محمد طیب صاحب کے ذوق اور مزاج کے بھی خلاف تھی اور شاید ملی مصالح بھی اس کی اجازت نہ دیتے ہونگے. بہر حال مولانا حسین احمد صاحب پھر بھی بزرگ انسان تھے. قاری محمد طیب صاحب سے بہت تعلق رکھتے تھے. نسبتوں کا بھی احترام کرتے تھے. ان کی وضع داری، علم و بردباری اور زہد وتقویٰ یہ سب چیزیں ایسی تھیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا. لیکن اس کے ساتھ ان کا ایک خاص سیاسی مزاج بھی تھا

اور اس سیاسی مزاج کے اثرات دارالعلوم کی فضاؤں میں صاف طور پر محسوس کئے جاتے تھے .ان کے صاحب زادے مولانا اسعد مدنی صاحب میں نہ کوئی ذاتی قابلیت تھی اور نہ اپنے والد بزرگوار کی خوبیوں میں سے ان کو کچھ حصہ ملا تھا...... اس لئے میں نے عرض کیا کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب کا جانا ایک شخصیت کا جانا نہیں تھا بلکہ ایک عہد کی بساط کا سمٹ جانا تھا...... اور دارالعلوم کی روایات کا الٹ جانا تھا...... اس لئے ارباب علم و دانش اس صورت حال پر بڑے فکر مند تھے اور مجلس شوریٰ میں ہی کچھ ارکان ایسے تھے جو ان باریکیوں کو محسوس نہیں کرر ہے تھے...... ایسے لوگ مولانا اسعد میاں صاحب کے ہم نوا بن گئے...... دارالعلوم دیو بند کے اندر سے بھی ان کو سپورٹ کرنے والے منفعل قسم کے لوگ ان کے حامی ہو گئے. دارالعلوم کے اندر کے لوگوں میں ایک نمایاں نام مولانا وحید الزماں کیرانوی کا اور دوسرا نام مولانا معراج الحق صاحب کا ہے. یہ دونوں ہی حضرات آخیر میں اپنے رویے پر پشیمان نظر آئے لیکن اب تلافی مافات کا وقت گذر چکا تھا...... باہر کے لوگوں میں چند نمایاں ناموں میں سے مولانا منظور احمد نعمانی اور قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کا ہے. ان میں سے مولانا نعمانی بھی اخیر میں معلوم ہوتا تھا کہ نادم و شرمندہ ہیں. انھوں نے مولانا قاری محمد طیب صاحب کو ایک خط لکھا...... قاری صاحب نے اس خط کا جواب دیا ہے. وہ ان کے درد دل، وسعت ظرفی اور خلوص وللٰہیت کا آئینہ دار ہے...... [1]

محترم المقام مولانا محمد منظور نعمانی زید مجدکم!

السلام علیکم.

گرامی نامہ مورخہ ۲۸/اپریل ۱۹۸۳ء باعث شرف اور موجب تسلی ہوا. یہ میرے لئے روح کی غذا اور صحت مندی کی علامت ہے. آج کا دور کرب کا دور ہے. اخلاقی انتشار عالمی پیمانے

[1] (ذکر طیب (سوانح عمری) ناشر دارالکتاب دیو بند صفحہ ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱)

پر بڑھ رہا ہے۔ننانوے فیصد غلط فہمیاں چھائی ہوئی ہیں۔اور ایک فیصد حقیقت پر حاوی ہیں۔دارالعلوم دیوبند صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔آج کے لادینی دور میں دین کے ہر شعبہ میں امت کی رہنمائی اور عوام امت کی خدمت اس کا نصب العین رہا ہے۔ آج اس کا کیا حال ہے اور ہم اللہ کے سامنے مسئول ہیں۔یہ ہے وہ سوز جس سے میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔میں دہلی میں پنتھ اسپتال میں رہا اب دیوبند ہوں۔میرا کھانا پینا صرف دوا ہے۔ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کوئی مرض نہیں اور حال یہ کہ دوسروں کے ہاتھوں میں ہوں۔نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا بلکہ غم دارالعلوم کا ہے۔ جماعت ۱۱۶ر برس تک اوروں کے لئے ہدایت ،تقویٰ اور توحید کی علامت تھی بکھر گئی۔یہی میری بیماری ہے۔ ویسے یہ عمر کا تقاضہ ہے۔اس عالم بے چارگی میں آپ کا مکتوب گرامی ملا۔ جسے میں اپنے لئے اور دارالعلوم کیلئے روحانی صحت مندی کی علامت سمجھتا ہوں۔آں محترم نے معافی کے الفاظ لکھے ہیں۔آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں اپنے چھوٹوں کو بھی خطاوار نہیں سمجھتا کہ ان کی زبان پر معافی کی بات آئے۔معاملہ ہم میں سے کسی کی ذات کا نہیں نہ معافی کا۔ بلکہ ہمارے اسلاف کی یادگار دارالعلوم کا ہے۔ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ تعالیٰ سے مانگیں۔اور کچھ مانگیں تو دعا یہ مانگیں ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جواب دہی سے نجات ملے۔

من و تو ہر دو خواجہ تاشا نیم
بندۂ بارگاہ سلطانیم

اس دن سے جس نے دار العلوم اور جماعت دار العلوم کو یہ دن دکھائے میں نے تین الفاظ اختیار کر لئے ہیں السکوت و الصبر و الغنی. انہی تینوں پر اب بھی قائم ہوں. زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دار العلوم کا پہلا رنگ جس میں روحانیت تھی، خلوص تھا اور سب ایک تھے اور فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے، پھر بحال ہو جائے. آں محترم سے دعا کی درخواست ہے. والامر بید اللہ الکریم.

والسلام

محمد طیب غفرلہٗ

۸۳/۵/۷

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اپنی ممتاز علمی شخصیت کے ساتھ سیاسی خیالات بھی رکھتے تھے...... اور ان کے خیالات کا اثر دار العلوم کی فضاؤں میں واضح طور پر محسوس ہوتا تھا...... جمعیۃ العلمائے ہند حضرت مولانا مدنیؒ جس کے صدر تھے. آل انڈیا کانگریس کے ساتھ منسلک سمجھی جاتی تھی اور دار العلوم دیو بند ایک طرح سے جمعیۃ العلماء ہند کا کیمپ بن گیا تھا جب کہ دار العلوم کی روایت یہ رہی ہے کہ اس کو ہر طرح کے سیاسی اثرات سے پاک وصاف رکھا جائے اور اس میں صرف علوم دینیہ کی تعلیم اور تربیت ہو.

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے مرض وفات میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو یہ نصیحت فرمائی کہ:

''میں نے قرآن وسنت اور عمر بھر کے تجربے نیز جن لوگوں کی خدمت کا شرف حاصل ہوا ہے ان سب کے طرز عمل سے مدرسہ (دار العلوم) کے بارے میں جو کچھ اصلح سمجھا وہ یہ ہے کہ مدارس اور ان کے متعلقین کو سیاست حاضرہ سے بالکل مجتنب

رہنا چاہئے اور صرف سیاسیات ہی نہیں بلکہ ہر اس کام سے جو تعلیمی کام میں خلل انداز ہو. اگر چہ وہ کام فی نفسہ کیسا ہی محمود اور مفید کیوں نہ ہو. ہمارے بزرگوں نے طلباء کو بیعت کرنے اور سلوک میں مشغول ہونے سے بھی باوجود اس کے اہم سمجھنے کے طالب علمی کے زمانے میں ہمیشہ منع فرمایا ہے.

حضرت گنگوہیؒ کسی طالب علم کو فراغت سے پہلے بیعت نہ فرماتے تھے. پھر کسی سیاسی یا ملکی تحریک میں شرکت کیسے گوارا کی جاسکتی ہے.

پھر دوبارہ ۲۹ر جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مولانا تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت تھانویؒ نے پورے اہتمام کے ساتھ مولانا قاری محمد طیب صاحب کے سامنے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں تقریباً سوا گھنٹہ گفتگو فرمائی. خاص اہتمام یہ کیا کہ اس مجلس میں خواجہ عزیز الحسن، مولانا شبیر احمد تھانوی، مفتی جمیل احمد تھانوی اور ڈپٹی سجاد علی کو بھی شریک کیا اور فرمایا کہ:

''مدرسہ دیوبند کو سیاسیات سے بالکل الگ رہنا چاہئے اور یہی ہمارے اکابر کا طریق کار تھا. تعلیم کے زمانے میں کسی دوسری طرف توجہ کو سخت مضر فرماتے رہے. اور ظاہر ہے کہ معلمین کے طرز عمل کا طلبہ پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے. لہٰذا مدرسہ کے مدرسین کو بالخصوص طلبہ کی مصلحت سے سیاسیات سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے اور مدرسین کے دوسری طرف متوجہ ہونے سے تعلیم کا حرج بھی شاید ہے. ایک ایسی جماعت کی بھی سخت ضرورت ہے جو محض علم دین کی خدمت کرے.

حق تعالیٰ کے ارشاد **الـذین مکناھم فی الارض اقامو الصلوٰۃ (الایہ)** سے واضح ہے کہ دیانت مقصود بالذات ہے اور سیاسیات و جہاد اصل نہیں بلکہ اقامت دین کا وسیلہ ہے اور دیانت مقصود اصلی ہے. لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں بلکہ اس کا درجہ بتانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصود نہیں اور

دیانت خود مقصود اصلی ہے. اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہئے اور رہنی چاہئے جو خالص عبادت، دیانت اور تعلیم دین میں مشغول رہے اور وہ جماعت اہل مدارس ہی کی ہوسکتی ہے. اس لئے میری پختہ رائے یہ ہے کہ طلباء کو سیاسیات میں مبتلا نہ کیا جائے. طلباء اگر ان قصوں میں پڑ گئے تو وہ تعلیم سے بھی جاتے رہیں گے. اور تربیت بھی ان کی نہ ہوگی. چنانچہ جب سے طلباء کو اس سلسلے میں ڈال دیا گیا ان میں آزادی پیدا ہوگئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ہی لوگ ہر وقت ان کی طرف سے متفکر اور خائف رہتے ہیں. [1]

(۱۸)

وہ شب تاریک......

۲۳/مارچ ۱۹۸۲ء کی رات وہ شب تاریک تھی جس میں رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر مولانا اسعد مدنی کے گروپ نے دارالعلوم دیوبند پر اچانک قبضہ کرلیا. ایک طرف اس اچانک حادثے کی سنگینی کا اندازہ لگائیے اور دوسری طرف حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے صبر اور استقامت کو محسوس کیجئے. صبح کے وقت جب ایک ضعیف بوڑھے کو اطلاع دی گئی کہ وہ دارالعلوم جس کو اس نے ساٹھ سال تک اپنے خون جگر سے سینچا تھا اور جس کے بقا اور استحکام کے لئے ان کے اجداد نے اپنے اوپر دن کا چین اور رات کی نیند حرام کرلی تھی، وہ امانت جس کو یہ انسان اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا، اب اس سے چھین لی گئی ہے اور اس پر چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح

---

[1] (ذکر طیب صفحہ ۲۴۲)

دیواریں پھاند کر قبضہ کرلیا گیا ہے تو اس کے درد بھرے سینے سے ایک آہ نکلی اور صرف ایک جملہ زبان سے ادا ہوا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون. کچھ دیر یہ بوڑھا اپنا درد سینے میں چھپائے سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا. پھر انتہائی صبر و استقامت کے ساتھ اٹھا، گھر والوں سے صرف اتنا کہا دارالعلوم اللہ کی امانت تھی، اس نے جب تک چاہا خدمت کا موقع دیا ہمیں اس کی رضا پر راضی رہنا چاہئے.

اہل خانہ کا بیان ہے کہ پھر انھوں نے سب کو اس طرح کھانا پکانے اور مختلف کاموں میں لگا دیا کہ ادھر سے اس حادثے سے سب کا دھیان بٹ جائے اور فوراً گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر اس طرح واقعات اور قصے بیان کرتے رہے کہ سب اس حادثے کو بھول کر دوسری طرف لگ جائیں اور یہی ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد اس سوگوار ماحول میں تبدیلی آ گئی اور سب یہ بھول گئے کہ کیا قیامت سروں کے اوپر سے گذری ہے.

بے شک یہ کڑی آزمائش اور سخت امتحان تھا لیکن قاری محمد طیب صاحب استقامت کا ایک ایسا پہاڑ ثابت ہوئے کہ ان کو کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا.

اپنے تو اپنے کبھی کسی مخالف کیلئے بھی کوئی گرا ہوا لفظ ان کی زبان سے کسی نے نہیں سنا...... بے شک وہ گالیاں سن کر دعائیں دینے والوں میں سے تھے......

مجھے بار بار حضرت قاری صاحب کے کردار کو دیکھ کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کی شہادت یاد آتی تھی...... کہ اپنی نرم خوئی اور صلہ رحمی کے باوجود جب مخالفین نے ان کو گھیر لیا تو وہ اسی طرح ثابت قدم رہے اور اپنی جان کی کوئی پرواہ نہیں کی.

اہل حق کے لئے ایسی آزمائش کوئی نئی نہیں ہے...... اجالے اندھیروں کے مقابلے میں ہی پہچانے جاتے ہیں......اور علم جہالت سے ہی ممتاز ہوتا ہے.

قبضہ کرنے والے مشاق قسم کے لوگ تھے. اس سے پہلے جمعیۃ العلماء ہند کے

دفتر پر قبضہ کی ریہرسل ہوچکی تھی...... پگڑیاں اچھالنے کے ماہر تھے. مولانا حفظ الرحمٰن جیسے مجاہد ملت، مولانا محمد میاں صاحب جیسے خاموش خدمت گار اور مفتی عتیق الرحمٰن جیسے مخلص و درد مندان کے ستم کا نشانہ بن چکے تھے...... پھر مولانا قاری محمد طیب صاحب ہی کیوں باقی رہتے...... اپنے تیروں کی آزمائش ان پر خوب خوب کی گئی. طرح طرح کے الزامات، تہمتیں اور آخر کار اہل علم کی بے وقاری، رسوائی اور جگ ہنسائی......

ترکش نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

(۱۹)

دو دارالعلوم

اس دردناک داستان کا آخری باب یہ ہے کہ اس اختلاف کے نتیجے میں دارالعلوم دولخت ہوگیا...... اصل عمارت میں مقبوضہ دارالعلوم (رجسٹرڈ) دارالعلوم کہلایا......

اور دوسرا دارالعلوم حضرت قاری صاحب کے زمانے میں ہی جامع مسجد میں قائم ہوا اور وقف دارالعلوم کہلایا. اب وقف دارالعلوم بھی اپنی جدید عمارت میں منتقل ہو چکا ہے. دونوں مدرسے اپنی اپنی جگہ اپنے وسائل کے مطابق خدمت انجام دے رہے ہیں. رجسٹرڈ دارالعلوم اپنے انتظام اور وسائل کے اعتبار سے خاصا مستحکم ہے.

اور اس سچائی کا کھلے منھ سے اعتراف کرنا چاہئے کہ تعلیم کے بعض شعبوں میں رجسٹرڈ دارالعلوم میں حیرت انگیز اصلاح ہوئی ہے. رجسٹرڈ دارالعلوم ہو یا وقف دارالعلوم دونوں ہی ادارے ملت کی امانت ہیں. اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے اور ان کو ترقی اور استحکام دے.

(۲۰)

ملنے کے نہیں! نایاب ہیں ہم......

آخر وہ وقت موعود بھی آ پہنچا جو دنیا میں ہر آنے والے کا مقدر ہے......موت ایک اٹل قانون ہے اور دیکھا جائے تو انسانی عروج کی منزل ہے. اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّکَ مَیِّتٌ وَاِنَّھُمْ مَیِّتُوْن حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ۱۸؍رجب ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۳؍دسمبر ۱۸۹۷ء کو دنیا میں تشریف لائے تھے. اور ۶؍شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء کی صبح انھوں نے اس عالم فانی میں آخری سانس لی اور روح پاک رب اعلیٰ سے جا ملی......ان کی وفات کی خبر کوئی معمولی خبر نہ تھی. پورے ملک میں کہرام مچ گیا. لاکھوں اشک بار آنکھوں نے آنسوؤں کے نذرانے پیش کئے. بڑے صاحب زادے مولانا محمد سالم صاحب قاسمی، مہتمم (وقف دارالعلوم) نے اسی احاطہ مولسری میں نماز جنازہ پڑھائی جہاں کتنے ہی اللہ کے نیک بندوں کی نماز جنازہ ہو چکی تھی. اور جس کے بارے میں کچھ ایسے اشارے ملتے ہیں کہ اس جگہ پر نماز جنازہ بھی قبولیت کی ایک علامت ہے. دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل برادر عزیز مولانا عبید اقبال عاصم

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے اپنے ایک مضمون میں آپ کی وفات کا منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کا دن موسم کا گرم ترین دن تھا. صبح سے ہی گرمی شباب پر تھی. ساڑھے گیارہ بجے جامع مسجد سے حضرت کے وصال کا اعلان ہوا. یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی. لوگ جوق در جوق حضرت کے دولت کدہ کی طرف بڑھتے گئے. موسم ایک دم خوشگوار ہوگیا. عشاء میں تدفین ہوئی. میت کو کاندھا دینے کے لئے خدا کی خلقت امنڈ پڑی. احاطہ مولسری میں نماز جنازہ ادا کی گئی. دیوبند میں نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی نہ اتنی بڑی تعداد کسی نے دیکھی اور نہ کسی نے سنی. حاضرین کی تعداد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ احاطہ مولسری سے لیکر دیوان تک تل دھرنے کی جگہ نہ تھی. یہ ان کی عنداللہ اور عندالناس مقبولیت کی علامت تھی. اس گرم ترین دن کی رات جب حضرت کی تدفین ہوئی تو موسم اتنا سرد ہوگیا کہ باشندگان دیوبند گرمی کی اس رات کی رضائیوں کو تاہنوز نہیں بھولے ہیں.''

آخر اس پیکر علم وعمل کو ان کے دادا مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے داہنے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا. آج فخر ملت احمد زیر خاک آرام فرما ہیں. یہ اس شہید وفا کا مزار ہے جسے اپنوں کے ستم نے گھائل کر کے رکھ دیا تھا.

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کے اے لئیم
تونے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

ملت کے وہ لوگ ان زخموں کا حساب کس طرح دیں گے جنھوں نے اس

پاکیزہ روح کو گھائل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی...... یوم الحساب ایک دن ہونا ہے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونا ہے......

ملت کے دردمندوں کی یہ تحریریں اور تاثرات ملاحظہ فرمائیں جو اس عظیم ہستی کے چلے جانے پر ان کی زبان وقلم سے ظاہر ہوئے ہیں. بیچ بیچ میں ہم نے ان تحریروں کا کچھ جائزہ اور وضاحت بھی پیش کر دی ہے تا کہ واقعات اور اچھی طرح نکھر کر قارئین کے سامنے آ جائیں. یہ نقوش وتاثرات بتاتے ہیں کہ انسان وہ بھی ہیں جو مر کر بھی زندہ وجاوید رہتے ہیں.

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(۲۱)

نقوش وتاثرات

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسی جامع صفات شخصیت کی زندگی کو الفاظ کے دائرے میں لانا، ان کی ہر صفت کا احاطہ کرنا اور ان کی خصوصیات کا ایسا مرقع پیش کرنا جس میں ان کی پوری زندگی سمٹ آئے ناممکن نہ سہی مگر مشکل ضرور ہے. پھر ہر ایک کا اپنا زاویہ نظر جو اس شخصیت کے اس رنگ کو ابھارتا ہے جو اس کی نظر میں زیادہ اہم ہوتا ہے.

نقوش وتاثرات کے عنوان سے ہم نے کچھ اہل نظر کی خاص خاص تحریروں کا اپنے جائزے اور وضاحت کے ساتھ احاطہ کیا ہے تا کہ حضرت قاری صاحبؒ کی

شخصیت کا ہر رنگ اور انداز سامنے آجائے.

﴿۱﴾

مولانا محمد سالم صاحب قاسمی حضرت قاری صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں اور اس وقت دارالعلوم (وقف) کے مہتمم ہیں...... ان کی تربیت میں حضرت مہتمم صاحب کی توجہ کی جھلک ملتی ہے. اس میں شک نہیں کہ اپنے فکر اور صلاحیت ہر اعتبار سے مولانا محمد سالم صاحب اپنے والد مرحوم کے جانشین ہیں.

دارالعلوم کے تنازعے میں سب سے زیادہ زیر گفتگو مولانا سالم صاحب کی شخصیت رہی ہے...... مخالفین کا کہنا یہ تھا کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب ان کو نائب مہتمم بنا کر اپنی جگہ مہتمم بنانا چاہتے ہیں...... اس بات کو اتنا اچھالا گیا کہ جیسے یہ حضرت مہتمم صاحب کے خلاف جرائم کی فہرست میں سب سے سنگین جرم ہو...... ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ حضرت مہتمم صاحب کی یہ خواہش رہی ہوگی کہ مولانا سالم صاحب جن کی تعلیم و تربیت میں حضرت مہتمم صاحب نے بڑی محنت کی ہے وہ وقت آنے پر اہتمام کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیں، تو یہ خواہش کوئی ناپسندیدہ خواہش نہیں ہے، جس کو مہتمم صاحب کا جرم کہا جا سکے...... ہاں اگر وہ کسی نااہل کو اپنی جگہ کے لئے منتخب کرتے تو بے شک ایسا کرنا غیر مناسب ہوتا.

مولانا سالم صاحب اپنے والد کی نظر میں اس کے اہل تھے...... انتخاب شوریٰ کو کرنا تھا...... فیصلہ مجلس شوریٰ کا ہوتا اور ظاہر ہے کہ مجلس شوریٰ ہر پہلو کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کرتی...... مگر اس سے پہلے ہی دارالعلوم کے حالات بدل گئے اور دارالعلوم کے قدیم دفتر اہتمام میں مولانا محمد سالم صاحب کے قدم نہیں پہنچ سکے لیکن آخر مولانا قاری محمد طیب صاحب کی یہ خواہش پوری ہوگئی کہ وہ وقف دارالعلوم کے مہتمم مقرر کئے گئے اور ان کی سربراہی میں آج بھی وقف دارالعلوم قائم ہے.

مولانا سالم صاحب نے اپنے والد کے بارے میں امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے جملے نقل کئے ہیں. عطاء اللہ شاہ بخاری زبان کے بادشاہ تھے...... انھوں نے اپنے انداز میں مولانا قاری محمد طیب صاحب کی جامع شخصیت کو کس طرح بیان کیا ہے یہ پڑھنے کے قابل ہے...... کہتے ہیں:

''خطیب بے مثال امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے اپنی طلاقت لسان، وضاحت کلام اور جامعیت خطاب پر مشتمل ایک علیم وطویل حقیقت کو خیر المدارس جالندھر میں پیرایۂ اختصار عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

''اگر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جامع الصفات ذات گرامی کو دیکھنے والا قسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے حقائق اسلام کی حکمت آفرینیوں کے ساتھ حضرت اقدس شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو کتاب اللہ کے ظاہر و باطن کے انسانیت نواز علوم کے ساتھ حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو حقائق و احکام اسلام پر ناقابل شکست استدلال کے ساتھ حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کو تفقہ اسلام کی مدلل راہ نمائی کے ساتھ فقیہ الاسلام حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو علم وعرفان کی بہم آمیز جرأت ایمانی کے ساتھ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ دیوبندی کو عالم بے عدیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو ان کی منفرد قوت حفظ واتقان کے ساتھ علم حدیث پر مثالی وسعت نظر کے ساتھ محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کو، بے مثال طلاقت و فصاحت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کو تفقہ فی الدین اور کمال اتباع سنت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو، فراست ایمانی وتدبر کامل کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو، اور علم وعرفان، زہد واتقاء اور فضل وکمال کے پیکر جمال کے ساتھ حکیم الامت حضرت

اقدس مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کو دیکھا ہے، تو میرا دل اس پر یقین رکھتا ہے کہ انشاءاللہ وہ عنداللہ حانث نہیں ہوگا.

اس کے بعد مولانا محمد سالم صاحب نے نقل کیا ہے کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی وفات سے دو دن پہلے حضرت حکیم الاسلام مزاج پرسی کے لئے تھانہ بھون تشریف لے گئے تو حضرت تھانوی نے فرمایا کہ:

آپ کے آنے سے مجھے علالت میں خفت معلوم ہوتی ہے. بدن میں قوت اور روح میں بشاشت بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے.

اگلے روز دارالعلوم دیوبند میں مجلس شوریٰ کے اجلاس کی وجہ سے حضرت حکیم الاسلام نے تھانہ بھون سے دیوبند واپسی کا ارادہ کیا اور اجازت کیلئے فجر کے بعد حضرت تھانویؒ کے مکان پر حاضر ہوکر عرض کیا کہ حضرت جانے کو تو آپکے پاس سے جی نہیں چاہتا لیکن مجلس شوریٰ ہے. اس کی وجہ سے جانا بھی ضروری ہے. اس لئے میں بطیّب خاطر نہیں بلکہ بضیق خاطر واپسی کی اجازت لینے کیلئے حاضر ہوا ہوں. اس وقت وہاں مولانا شبیر علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے.

یہ سن کر حضرت تھانویؒ نے حضرت قاری صاحب کو قریب آنے کا اشارہ فرمایا کہ مجلس شوریٰ کی وجہ سے جانا بھی ضروری ہے گو میرا دل ہی آپ کو واپسی کی اجازت دینے کو نہیں چاہ رہا ہے.

پھر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما پھر آنکھوں سے لگایا پھر سر پر رکھا.

جس سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب غیر معمولی طور پر شرمندہ اور آبدیدہ ہو رہے تھے.

پھر حضرت تھانویؒ نے آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ...... میرا وقت آخیر ہے یہ ہاتھ میں نے اس لئے چوما اسے سینے اور سر پر لگایا کہ اس ہاتھ کے لگانے سے مجھے حضرت

اقدس نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحب، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت گنگوہیؒ، اور جماعت کے تمام بزرگوں کی نسبتوں کی برکتیں اور غیر معمولی سکون قلب حاصل ہوا. اللہ رب العزت نے آپ کی ذات میں ان تمام سنتوں کو جمع فرمادیا ہے.

اس وقت جو لوگ وہاں موجود تھے سبھی آبدیدہ تھے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ حضرت اقدس تھانویؒ کے اس مشفقانہ عمل کو میں اپنے لئے عظیم سعادت عظیم شہادت اور وسیلہ مغفرت سمجھتا ہوں.

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے بزرگ جو نہ صرف بے مثال خطیب بلکہ امیر شریعت بھی تھے ان کے یہ قابل قدر الفاظ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جو نہایت محتاط بزرگوں میں تھے ان کی یہ شفقت اور اظہار تعلق اور پھر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی بے مثال دینی خدمات ان سب کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ واقعۃً قاری صاحبؒ کی شخصیت ایک جامع شخصیت تھی اور ان کی ذات میں اسلاف کے اوصاف کا جوہر جمع ہوگیا تھا.

اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت کی عظمت کے مطابق ان کو نہایت سخت آزمائش کا سامنا کرنا پڑا.

حدیث شریف میں آتا ہے کہ **اشد بلاء الانبیاء ثم الامثل فاالا مثل** کہ سب سے سخت آزمائش انبیاء کرام کی ہوتی ہے، پھر ان سے نیچے لوگوں کی اور پھر ان سے نیچے لوگوں کی.

اس سخت آزمائش کے وقت میں مولانا قاری محمد طیب صاحب کے جوہر اور زیادہ کھلے مخالفین کی باتوں پر سکوت اور ہر چیز سے استغنا ان سب باتوں نے ان کی عظمت کو اور زیادہ بڑھا دیا اور ثابت ہوگیا کہ وہ ایسے کھرے سونے کی طرح تھے جو آزمائش کی بھٹی سے تپ کر کندن بن جاتا ہے.

ہمیں یقین ہے اور ہم اللہ کی رحمت سے امید رکھتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا گیا آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو عظیم مراتب سے نوازے گا.

آج وہ دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی خدمات کا فیض قیامت تک جاری رہنے والا ہے.

﴿ ۲ ﴾

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب عثمانی دیوبندی سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کو کون نہیں جانتا. اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی بہت سی نعمتوں کے ساتھ ان کو اولاد صالح کی نعمت سے بھی نوازا. ان کے بڑے بیٹے مولانا محمد رفیع صاحب دارالعلوم کراچی کے مہتمم ہیں. اور ان کے چھوٹے بیٹے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب پاکستان کی شریعت بینچ کے جج ہیں. اپنی پاکیزہ تحریروں، متوازان فکر، فقہی بصیرت اور وسیع النظری کی وجہ سے عالم اسلام کے ممتاز لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات پر انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار بڑی بے ساختگی اور گہرائی کے ساتھ کیا ہے. لکھتے ہیں کہ:

> ''حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات کسی ایک شخص کی وفات نہیں. یہ ایک پورے عہد کا اس کے مزاج و مذاق کا اور اس کی دلآویز خصوصیات کا خاتمہ ہے. انا للہ وانا الیہ راجعون.

وما کان قیس ہلکہ ہلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تہدما

حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند کے اس بابرکت دور کی دلکش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت علامہ

انور شاہ کشمیریؒ، اوران جیسے دوسرے حضرات کا جلوۂ جہاں آرا دیکھا تھا. جس ہستی کی تعلیم وتربیت میں علم وعمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو، ان کے اوصاف و کمالات کا ٹھیک ٹھیک ادراک بھی ہم جیسوں کے لئے مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت قاری صاحب کے پیکر میں معصومیت، حسن اخلاق اور علم وعمل کے جونمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل ودماغ سے محونہیں ہوسکتے''.

بالکل صحیح لکھا مولانا تقی صاحب نے حضرت شیخ الہند، حضرت تھانوی، علامہ انور شاہ کشمیری کے جلوۂ جہاں آرا کا یہ پیکر ساٹھ سال تک درالعلوم دیوبند کی گاڑی کو ٹھیک ٹھیک اسی پٹری پر چلاتا رہا جوان اسلاف واکابر نے بچھادی تھی...... قرآن و حدیث کی وہ ڈگر، وہی طریقہ، وہی نمونہ اور وہی مثالی انداز جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اوران کے پاکیزہ سیرت ساتھیوں کی زندگیوں میں ملتا ہے...... وہی مذاق، وہی مزاج جو سلسلہ بہ سلسلہ چلا آرہا ہے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اپنی زندگی میں جذب کرلیا تھا اور اس کا اظہار ان کی زندگی کے ہر ہر انداز سے ہوتا تھا.

مولانا تقی صاحب آگے لکھتے ہیں...........

''حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے پوتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے حکمت دین کی جو معرفت نانوتوی قدس سرہٗ کو عطا فرمائی تھی اس دور میں حضرت قاری صاحبؒ اس کے تنہا وارث تھے. حضرت نانوتویؒ کے علوم کو جن حضرات نے اپنے مزاج و مذاق میں جذب کر کے انہیں شرح وبسط کے ساتھ امت کے سامنے پیش کیا ان میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے بعد حضرت قاری صاحبؒ کا کوئی ثانی نہیں تھا.''

اور یہی وہ امتیاز اور خصوصیت ہے جس کا اظہار مولانا تقی صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے. کہ حکمت دین کی جو معرفت اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتوی کو عطا فرمائی تھی حضرت قاری صاحب اس کے تنہا وارث تھے. اہل علم اس وقت بھی تھے اور اب بھی ہیں لیکن یہ امتیاز جو حضرت قاری صاحب کو حاصل تھا وہ ان کے دور کے دوسرے علماء میں نہیں تھا...... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے بیان کردہ دین کے اسرار و حکم کا سمجھنا اور ان کی گہرائی تک پہنچنا ہر ایک کے بس کا نہ تھا. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے ان کو اپنے انداز میں اتنا آسان بنا کر پیش کیا کہ ان کی تقریر و تحریر اور ان کی زندگی حکمت قاسمیہ کی تفسیر بن گئی...... مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے فتح الملہم میں جگہ جگہ حضرت نانوتویؒ کے حوالے دیئے ہیں. جب وہ تمام بحثوں کے بیان کرنے کے بعد اور تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد قال نانوتوی کہہ کر حضرت نانوتوی کی بات کو نقل کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ دماغ میں چراغ سے جل اٹھے ہیں...... اتنی گہرائی سے سمندر کے موتی نکالنا یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایسی بصیرت تھی جو اپنے دور میں حضرت نانوتویؒ کو ہی حاصل تھی...... کاش نادان لوگ سمجھتے کہ ہم کیسے قیمتی موتی کو اپنے ہاتھ سے کھو رہے ہیں...... مگر یہ اقتدار کی ہوس بڑی عجیب ہوتی ہے سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے.

اس کے بعد مولانا تقی صاحب لکھتے ہیں کہ:..........

''حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کو تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس اور تصنیف کے لئے باقاعدہ وقت بہت کم ملا، اور نوعمری ہی میں دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان ادارے کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آ گئیں. ان ذمہ داریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو عموماً علمی مشاغل سے دور کر کے اس کی علمی استعداد پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں. لیکن

حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کا معاملہ اس لحاظ سے بھی حیرت انگیز تھا. انتظامی بکھیڑوں میں مبتلا رہنے کے باوجود ان کا علمی مذاق ہمیشہ تازہ اور انکی علمی استعداد سدابہار رہی.''

واقعی انتظامی بکھیڑوں کے باوجود حضرت قاری صاحب نے اچھی خاصی تعداد میں تصانیف و تالیفات کا ذخیرہ چھوڑا ہے اور بہت سے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے...... بہت سے اہم مسائل کو حل کیا ہے. ان کی تصانیف میں ایک اہم کتاب ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' بھی ہے...... جس میں انھوں نے سورہ نحل کی آیت ادعو الی سبیل ربک کی روشنی میں دس دعوتی اصول قرآن پاک سے مستنبط کئے ہیں.

میں نے اکثر حضرت قاری صاحب کو دیکھا کہ کوئی کتاب میں نے پیش کی اور آپ نے اس کو پڑھنا شروع کر دیا تو بعض اوقات مطالعہ میں اتنے محو ہو جاتے تھے کہ کافی دیر تک نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے...... اصل میں علمی ذوق ان کی رگ و پے میں رچا بسا تھا. اب یہ غالباً دیگر اساتذہ کے علاوہ علامہ انور شاہ کشمیری کی شاگردی کا طفیل تھا کہ حضرت علامہ کے اکثر شاگرد مذاق علمی میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں......

اس کے بعد مولانا تقی صاحب نے ایک بڑی اہم بات لکھی ہے اور اس سے مولانا قاری محمد طیب صاحب کا سیاسی نقطہ نظر سامنے آتا ہے. وہ لکھتے ہیں کہ:

''پھر جب قیام پاکستان کی تحریک شروع ہوئی اور آزادئ ہند کے طریق کار سے متعلق علماء دیوبند کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو حضرت والد صاحبؒ کی طرح حضرت قاری صاحبؒ کا نقطہ نظر بھی حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی رائے کی طرف مائل تھا لیکن حضرت قاری صاحبؒ نے اپنے آپ کو عملی سیاست سے بالکلیہ یکسو کر کے ہمہ تن دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے لئے وقف کیا ہوا تھا، اس

لئے یہ نقطہ نظر اسٹیج پر نہ آ سکا۔‘‘

یہ بڑا اہم نکتہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں دو فکری دھارے کس طرح سے پیدا ہوئے. اصل میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کانگریس سے وابستہ تھے. متحدہ قومیت کے حامی اور جمعیۃ العلماء ہند کے صدر تھے. دوسری طرف مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مسلم لیگ کے حامی اور جمعیۃ العلماء اسلام کے صدر تھے. ان دونوں اکابر کی اپنے اپنے نقطہ نظر کے اظہار کیلئے اور اس میں اتفاق رائے قائم کرنے کیلئے ایک باقاعدہ نشست بھی ہوئی جس کی روئیداد مولانا قاری محمد طیب صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا محمد طاہر قاسمی نے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کی ہے جس کا نام ’’مکالمۃ الصدرین‘‘ رکھا ہے. دارالعلوم کی فضا میں ان دونوں نقاط نظر کا اثر تھا کیوں کہ مولانا حسین احمد صاحب دارالعلوم کے شیخ الحدیث تھے. طلباء سے ان کا قریبی رابطہ تھا اس لئے طلباء میں ان کی بات کا کچھ زیادہ اثر معلوم ہوتا تھا.

فکر و نظر کا یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے ایسی شکل اختیار کر گیا کہ ایک مستقل جماعت مولانا حسین احمد صاحب اور ان کے ہم نواؤں کی تھی اور دوسری جماعت ایسے لوگوں کی تھی جو مولانا قاری محمد طیب صاحب کے ساتھ اتفاق رکھتے تھے. اس طرح اہتمام اور تعلیمات ایک دوسرے کے مدمقابل نظر آتے تھے لیکن چوں کہ یہ دونوں ہی بزرگ مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا قاری محمد طیب صاحب بلند نظر تھے اور دارالعلوم کا مفاد ان کے پیش نظر رہتا تھا اسلئے اس فکری اختلاف نے کسی ٹکراؤ کی صورت اختیار نہیں کی. لیکن مولانا حسین احمد صاحب کے صاحب زادے مولانا اسعد مدنی صاحب اپنے والد سے بالکل مختلف ثابت ہوئے اور انھوں نے ایک بڑی لمبی سازش کر کے نہ صرف یہ کہ اہتمام کا تختہ پلٹ دیا اور پوری جماعت دیوبند کو سخت اذیت اور آزمائش میں مبتلا کر دیا. بلکہ دارالعلوم کے اس دھارے کو بھی جو اس کے بانی کے

وقت سے چلا آرہا تھا بدل کرر کھ دیا۔

مولانا منظور نعمانی صاحب حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک نکتہ اٹھاتے ہیں کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب شوریٰ سے ٹکرا گئے۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ مجلس شوریٰ جتنی طاقتور اور مستحکم قاری صاحبؒ کے زمانے میں ہوئی، اتنی کسی کے دور میں بھی نہیں رہی کیوں کہ اس مجلس شوریٰ میں ایسی ایسی ممتاز اور نمایاں ہستیاں تھیں جن میں سے ہر شخص ایک ادارہ تھا۔ ان کا کسی سے دبنے یا بکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ جن کی بے باکی اور حق گوئی سے ایوان پارلیمنٹ بھی تھراتا تھا۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ جن کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ اس وقت کے وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی کا گریبان برسر اجلاس پکڑ کر پوچھ سکتے تھے کہ آپ مسلمانوں کو سمجھتے کیا ہیں؟

مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ جیسے صاحب بصیرت، فعال و متحرک جنھوں نے پرسنل لاء بورڈ کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ حکومت بھی اس کے سامنے جھکنے پر مجبور تھی اور جنھوں نے برسر مجلس اس وقت کے وزیر اعظم چندر شیکھر کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر پوچھا تھا کہ اگر آپ کے خیال میں مسلم رہنماؤں نے بھنگ پی لی ہے تو کیا حکومت نے بھی بھنگ پی رکھی ہے؟

اور اس طرح کے کتنے ہی ممتاز اصحاب دانش اور ارباب علم اس وقت کی مجلس شوریٰ میں نظر آتے ہیں...... مولانا منظور نعمانی بعد تک کافی عرصہ حیات رہے۔ دل چاہتا تھا کہ ان سے پوچھا جائے کہ اسعد مدنی صاحب کے زمانے میں جو شوریٰ تشکیل پائی ہے اس کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟

بہر حال جو بات مولانا تقی صاحب نے اوپر کی سطروں میں کہی ہیں وہ نشان دہی کرتی ہیں کہ فکر کی یہ دو لہریں دار العلوم کے دریا میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں

اور بعد میں جو واقعات پیش آئے دراصل اسی اختلاف کا ایک نتیجہ ہے۔

آگے مولانا تقی صاحب لکھتے ہیں اور بجا طور پر حضرت قاری صاحبؒ کے کمالات کا اعتراف کرتے ہیں جو ان کو تصنیف و خطابت کے میدان میں حاصل تھا......

''اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کو تصنیف اور خطابت دونوں میں کمال عطا فرمایا، اگرچہ انتظامی مشاغل کے ساتھ سفروں کی کثرت بھی حضرتؒ کی زندگی کا جز ولاینفک بن کر رہ گئی تھی۔ حساب لگایا جائے تو عجب نہیں کہ آدھی عمر سفر ہی میں بسر ہوئی ہو، لیکن حیرت ہے کہ ان مصروفیات کے باوجود آپ تصنیف و تالیف کے لئے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ چنانچہ آپ کی دسیوں تصانیف آپ کے بلند علمی مقام کی شاہد ہیں اور ان کے مطالعہ سے ان کی عظمت و محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں، حضرت قاری صاحبؒ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے۔ نہ جوش و خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پر تکلف لسانی، لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر موثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے۔ مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہوکر رہ جاتے تھے۔ جوش و خروش نام کو نہ تھا لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر سبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب و دماغ کو نہال کر دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ منھ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار ٹھیراؤ تھا۔ جو انسان کو زیر وزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا''

اس کے بعد حضرت قاری صاحب کی تقریر کی اثر انگیزی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا تقی صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا ہے. لکھتے ہیں......

''حضرت قاری صاحبؒ نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے.

لاہور میں ایک صاحب علماء دیوبند کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے سے بہت متاثر اور علماء دیوبند سے بری طرح برگشتہ تھے. طرح طرح کی بدعات میں مبتلا بلکہ ان کو کفر وایمان کا معیار قرار دینے والے، اتفاق سے قاری صاحبؒ لاہور تشریف لائے اور وہاں ایک مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان ہوا. یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ان کے وعظ میں اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا. اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کرونگا.

لیکن اول تو ابھی تقریر شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت قاری صاحبؒ کا معصوم اور پرنور چہرہ دیکھ کر ہی میرے عزائم میں زلزلہ سا آگیا. دل نے اندر سے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی بے ادب، گستاخ یا گمراہ کا نہیں ہوسکتا. پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے جو حقائق ومعارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ علم دین کسے کہتے ہیں. یہاں تک کہ تقریر کے اختتام تک میں حضرت قاری صاحبؒ کے آگے موم ہو چکا تھا. میں نے اپنے سابقہ خیالات سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں ایسی بدگمانیوں سے نجات عطا فرمائیں.

بینک وبینہ عداوۃ کانک ولی حمیم...... مخالف کو موافق بنانے اور دشمن کو دوست بنانے کا یہی نبوی طریقہ ہے جس کو حضرت قاری صاحب نے تمام عمر اختیار کیئے رکھا. مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ سہارنپور کے پاس ایک جگہ ہے شیخو پورہ. وہاں ایک بزرگ کے مزار پر عرس ہوتا ہے جس کے سجادہ نشین دار العلوم دیوبند کے

مدرس مولانا محمد نعیم صاحب کے والد حکیم منعم صاحب تھے. انھوں نے مہتمم صاحب کو عرس کے موقعہ پر تقریر کے لئے دعوت دی. حضرت مہتمم صاحب نے دعوت قبول فرمالی. اور ایسی پر اثر تقریر فرمائی. جس سے بزرگان دین کی سچی محبت دل میں پیدا ہو اور بدعتوں سے خود بخود طبیعت میں دوری پیدا ہو جائے. کسی پر کوئی سیدھا اعتراض نہیں کیا. عرس کی تقریبات پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی بلکہ سچائی اور اسلام کی صحیح تصویر سامنے رکھ دی تاکہ خود دیکھ لیں کہ اسلام کی صحیح تعلیم کیا ہے......

دراصل دارالعلوم دیوبند کا مزاج اور مسلک اور ذوق یہی رہا ہے کہ مثبت انداز میں اس طرح رد کیا جائے کہ کوئی ضد اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہو اور بات اچھی طرح صاف بھی ہو جائے.

مولانا تقی صاحب نے آگے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا کہ حضرت قاری صاحب اور دارالعلوم کی آواز دنیا کے ہر گوشے میں پہنچی اور اس کے اثرات ظاہر ہوئے. لکھتے ہیں کہ......

''برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں حضرت قاری صاحبؒ کی آواز نہ پہنچی ہو. اس کے علاوہ افریقہ، یورپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں، اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا ہے.''

آگے لکھتے ہیں:......

''دارالعلوم دیوبند کا منصب اہتمام کوئی معمولی چیز نہ تھی، حضرت قاری صاحبؒ نے پچاس سال سے زائد اس منصب کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا. اس دوران دارالعلوم پر نہ جانے کتنے کٹھن اور نازک دور آئے لیکن حضرت قاری صاحبؒ نے ان تمام جھمیلوں کو نمٹایا اور اپنی ساری زندگی دارالعلوم کی خدمت کے لئے وقف کر دی. سخت سے سخت مرحلوں پر بھی انہیں پرسکون ہی دیکھا. اجلاس صد سالہ کا ہنگامہ دارالعلوم کے منتظمین کے لئے ایک کڑی آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا، دیوبند

جیسی مختصر جگہ میں لاکھوں افراد کے اجتماع کا انتظام انتہائی مشکل کام تھا، کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر سراسیمگی سے نجات حاصل نہ کرسکتا لیکن ٹھیک اجلاس کے افتتاح کے روز حضرت قاری صاحبؒ کے پاس حاضری ہوئی تو حسب معمول انہیں متبسم اور پرسکون دیکھا. چہرے پر تھکن ضرور تھی لیکن گھبراہٹ اور پریشانی نام کو نہ تھی.

افسوس ہے کہ اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں باہمی اختلافات نے جن طوفانی ہنگاموں کی شکل اختیار کی، انھوں نے ماضی کے تمام ہنگاموں کو مات کر دیا. دور ہونے کی وجہ سے ہمیں تمام حالات و واقعات سے واقفیت تو نہ تھی لیکن اس بات سے دل بے چین تھا کہ اس آخری عمر میں حضرت قاری صاحبؒ پر ان ہنگاموں کی وجہ سے کیا بیت رہی ہوگی؟ اس زمانے کے حالات اس قدر پیچیدہ اور ان کے بارے میں ملنے والی اطلاعات اتنی متضاد ہیں کہ اب حق اور ناحق کے فیصلہ تو شاید آخرت ہی میں ہوسکے گا لیکن اتنی بات واضح ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کے چھوٹوں نے ان کی نصف صدی سے زائد کی خدمات کا جو صلہ اس آخری عمر میں ان کو دیا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ ہے. حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی تک ایک خفیف سی امید باقی تھی کہ شاید اس بحران کا کوئی مناسب حل نکل آئے لیکن اب ان کی وفات نے اس امید کو بھی خاکستر کر دیا. حضرت قاری صاحبؒ کے دم سے دارالعلوم میں بزرگوں کی روایات زندہ تھیں اور اس کے مخصوص مزاج اور مذاق کی جھلک باقی تھی. اب دارالعلوم کی ان روایات کا اللہ ہی حافظ ہے.

حضرت قاری صاحبؒ کی وفات بلاشبہ پوری امت کیلئے سانحہ ہے اور ہم میں سے ہر شخص پر ان کا حق ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق انہیں ایصال ثواب کریں. اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں درجات عالیہ عطا فرمائیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی دولت سے نوازیں.

۳

مولانا عبد الرشید محمود گنگوہیؒ نے اپنے تعزیتی مکتوب میں جو حضرت قاری صاحبؒ کے صاحبزادگان کے نام تھا لکھا ہے کہ......

''ان کی شیریں زبانی، شگفتہ بیانی، صورت نورانی، ہوش مندی، فکرارجمندی ذہن اور دردمندیٔ دل کو کون بھلا سکتا ہے.
دوائر علمیہ ان کی جامعیت، علوم وافکار کا تنوع ہجر، ادبی ذوق، خوبی تعبیر، حسین و بدیع ترجمانی، مجامع میں خطاب گویا فلک اعلیٰ سے اذا الکلم، نخیل النیا انہ یوید کا ساکیف، حکمت ربانیہ ولی اللّٰہی بھی ابن جوزی کی سی سحر انگیزی بھی کس صاحب ذوق جوہر شناس کو رہ رہ کر یاد نہ آئے گی. عجزت النساء ان یلدن مثل طیب اب وہ کوہ کی بات کوہ کن کے ساتھ کس کس نادرہ اور حلیفہ پر تعجب کریں. زبان ایسی کہ سب سمجھیں، بیان ایسا کہ دل مانے عقل کی پاسبانی بھی لیکن کہیں کہیں اسے تنہا بھی چھوڑ دینے سے افکار اور افکار بھی دلائل عقلی بھی نقلی بھی جدلِ عدل بھی انفسی آفاقی بھی اور حقائق ومعرفت آگیں بھی.''

اس کے بعد پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے مولانا عبد الرشید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''میرے حضرت والد صاحبؒ علیل ہوکر شفایاب ہوئے تھے. دیوبند سے ایک بڑا مجمع حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، علامہ ابراہیم صاحبؒ اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحبؒ وغیرہ مزاج پرسی کو تشریف لائے. مولانا طیب صاحب ۲۵ رسالہ بھی ساتھ تھے. بعد مغرب کا وقت تھا. حضرت حکیم صاحبؒ نے فرمایا طیب

ایک رکوع سناؤ یاد ہے. ولقد خلقنا الانسان و نعلم ماتوسوس به نفسه الیٰ آخـره سنایا سماں بندھ گیا. آنکھیں پرنم ہوگئیں. میرے کانوں نے یہ خوش لحنی عمر میں پہلی مرتبہ سنی تھی. ساز بھی سوز بھی. دل گداز بھی نغمہائے دلکش سحاب اندر سحاب بھی. یہ پہلا نقش تھا جو آج بھی تازہ ہے"

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ" ان کی نسبت بھی بڑی تھی کہ وہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے پوتے اور مولانا محمد احمد صاحب کے بیٹے تھے. اس کے ساتھ ان میں ذاتی خوبیاں اور کمالات بھی بہت تھے. پھر یہ کہ ان کا فیض بہت دور دور تک پہنچا." مولانا عبدالرشید محمود کے الفاظ ہیں کہ:

"ان کی نسبت، حضرت مہتمم قاسم الخیرات کے بیٹے ہونا، ذاتی جمال و کمال، مکارم، خوش کلامی، خوش خطابی، خوش تعبیری، مضامین خوش نوائی لحن، لباس تلبس تک میں گونہ تزئین، جمال امتزاج اور رنگ علمی مذاکرہ میں نوابی انداز، جمال بھی کمال بھی نوال بھی مگر جلال نہیں (بہ مفہوم عرفی) ورنہ زندگی کے سب پہلو جلالت کے شاہد عدل اور ضخامت کے غماز جو بعد میں ایسے نمایاں ہوئے کہ فخر اماثل کہے گئے، یہ ہر گز نہ اطراء مادح تھا نہ مبالغہ. اللہ ان کی گور کو اپنے انوار سے معمور فرمائے.

خطہائے ارض میں کون سا مقام ہے جہاں انھوں نے اللہ اور رسول کا نام اور بات نہ کہی ہوگی. ایشیا، یورپ، مغرب اقصیٰ، مشرق وسطیٰ سب ان کے اعمال نامہ میں مکتوب و محفوظ ہیں."

(ماخوذ ماہنامہ الرشید صفر ۱۴۰۴ھ ہفت روزہ خدام الدین لاہور)

۴

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رجب ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء میں ممبر مقرر ہوئے تھے. اجلاس صد سالہ کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں جو

شورش برپا ہوئی اس میں مولانا منظور نعمانی، قاری محمد طیب صاحب کے سخت مخالف رہے اور اسی زمانے میں نہیں بلکہ ان کی مخالفت اس سے کئی برس پہلے شروع ہو چکی تھی. میں بذات خود اس کا شاہد ہوں کہ ۷۲ء میں جب میں نے ہفت روزہ عقائد میں مولانا اسعد میاں صاحب کے خلاف تنقیدی مضمون لکھا اور ان کے بعض اقدامات کی سخت مخالفت کی تو مجلس شوریٰ کے اجلاس کے موقع پر مولانا منظور نعمانی نے دارالعلوم کے مہمان خانے کے کمرے میں جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے مجھے تنہائی میں بلا کر بہت سمجھایا کہ اس طرح کے مضامین تمہارے لئے مناسب نہیں ہیں. انھوں نے جاننا چاہا کہ میری مولانا اسعد میاں سے کیا مخالفت ہے اور یاد رہے کہ اس وقت میں دارالعلوم میں بطور مدرس خدمت انجام دے رہا تھا. میں نے جواب میں عرض کیا کہ میری اسعد میاں صاحب سے کوئی ذاتی عداوت اور دشمنی نہیں ہے بلکہ وہ میرے استاد زادے ہیں اور مجھے شیخ الاسلا مولانا حسین احمد مدنی سے بیحد عقیدت ہے اور اس نسبت سے میں مولانا اسعد میاں صاحب کا بھی احترام کرتا ہوں، مگر جو کچھ وہ شوریٰ کی ممبری حاصل کرنے کے لئے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، میں ان کو دارالعلوم کے لئے نقصان دہ سمجھتا ہوں اور آپ حضرات کو بھی اسے محسوس کرنا چاہئے. اس لئے اگر وہ ایسی گری ہوئی حرکتیں کریں تو میں ضرور ان کے خلاف آئندہ بھی لکھوں گا......غرض یہ کہ میں نے مولانا نعمانی کی بات تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا. اس لئے یہ بات بالکل طے ہے کہ مولانا منظور نعمانی صد سالہ اجلاس سے بہت پہلے مولانا قاری محمد طیب صاحب کے مخالف تھے. اب یہ مولانا قاری محمد طیب صاحب کی خوبی ہے یا مولانا نعمانی کی بڑائی کہ ان کے مخالف بھی ان کے کمالات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں. چنانچہ مولانا نعمانی لکھتے ہیں......

''قاری صاحبؒ سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا سوائے اس کے کہ وہی اس زمانے میں دارالعلوم کی مسجد میں پانچوں وقت نماز پڑھاتے تھے. اللہ تعالیٰ نے خوب

روئی کے ساتھ خوش آوازی کی نعمت بھی بھرپور عطا فرمائی تھی. اور فن قرأت و تجوید میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ (قاری صاحب) ان کے اسم گرامی کا جز بن گیا تھا. جہری نمازوں میں ان کی قرأت بڑی دلکش ہوتی تھی. دارالعلوم دیکھنے کے لئے باہر سے آنے والے جس طرح دارالعلوم کی اس وقت کی دوسری دل آویز خصوصیات سے متاثر ہوتے تھے اسی طرح قاری صاحب کی نمازوں کی قرأت سے بھی بڑا اچھا اثر لیتے تھے.''

اس کے بعد مولانا نعمانی نے مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تقریر اور اس کے مؤثر ہونے کی تعریف کی ہے. لکھتے ہیں......

''وہ ہماری جماعت کے علماء میں جن کو اس عاجز نے دیکھا ہے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو مستثنیٰ کر کے سب سے اچھے مقرر اور واعظ تھے. ان کی تقریر بڑی عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی. مدوجزر اور جوش و خروش بالکل نہ ہوتا لیکن سامعین کے لئے بڑی دلکش اور تسکین بخش ہوتی. اللہ تعالیٰ نے مشکل مضامین کی تفہیم پر بڑی قدرت عطا فرمائی تھی.''

تیسری بات مولانا منظور نعمانی نے یہ تحریر فرمائی ہے کہ:

''رجب ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء میں جس کو آج چالیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں یہ عاجز دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب ہوا. اس کے بعد شوریٰ اور عاملہ کے جلسوں میں قاری صاحب سے برابر واسطہ رہا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان کو ظاہری محاسن میں خوبروئی، خوش آوازی اور خوش بیانی سے نوازا ہے اسی طرح باطنی محاسن میں خوش اخلاقی، تحمل، رعایت، مروت اور نرم مزاجی بھی بھرپور عطا فرمائی ہیں.''

یہ عجیب بات ہے کہ وہی خوبیاں خوش اخلاقی، تحمل، رعایت، مروت اور نرم مزاجی کہ جن کے ذریعے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ساٹھ سال تک

دار العلوم کو نہ صرف چلاتے رہے بلکہ ان کے زمانے میں دار العلوم نے بے انتہا ترقی کی انہی خوبیوں کو لے کر مولانا نعمانی یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ ان میں رعایت اور مروت اور نرم مزاجی حد سے بڑھی ہوئی تھی. جو دار العلوم دیو بند جیسے کسی ادارے کے منتظم کے لئے مناسب نہیں ہوتی. کیا یہ وہی خوبیاں نہیں ہیں جن سے کام لے کر حضرت قاری صاحب مرحوم ساٹھ سال تک دار العلوم کی نیا کے کھیون ہار بنے رہے. آج وہی خوبیاں عیب کیسے بن گئیں......

۴

جامعہ اشرفیہ لاہور پاکستان کا بڑا معروف مرکزی مدرسہ ہے. اس کے مہتمم مولانا عبید اللہ صاحب نے بڑا مفصل مضمون حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے تعلق سے ۲۰/فروری ۱۹۸۴ء کو تحریر فرمایا تھا. اس کے شروع میں پہلے کچھ سوانحی خاکہ دیا گیا ہے. اس کے بعد حضرت قاری صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں. مولانا عبید اللہ صاحب رقم طراز ہیں کہ......

’’آپ کا مولد قصبہ دیو بند ہے. تاریخ ولادت ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء ہے. تاریخی نام مظفر الدین ہے. سات سال کے ہوئے تو دار العلوم دیو بند میں داخل کروایا گیا. صرف دو سال کی قلیل مدت میں قرآن پاک قرآت و تجوید کے ساتھ حفظ کرلیا. پانچ سال فارسی اور ریاضی کے درجات میں تعلیم حاصل کی. اور پھر عربی نصاب شروع کیا. ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۸ء میں دار العلوم دیو بند سے فراغت اور سند فضیلت حاصل کی.

آپ کے اساتذہ میں علامۃ العصر مولانا محمد انور شاہ صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں. ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند سے بیعت فرمائی. حضرت کی وفات کے بعد آپ نے حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی طرف رجوع کیا اور ان سے تربیت باطنی و ظاہری حاصل کی. ۱۳۵۰ھ ۱۹۳۱ء میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی

تھانویؒ نے خلافت سے سرفراز فرمایا. فراغت کے فوراً بعد ہی آپ نے دارالعلوم دیوبند میں مسند تدریس کو رونق بخشی. ذہانت و فطانت تو آپ کو ورثے میں ملی تھی، جس کی بدولت آپ طلبا اور حلقہ مستفیدین میں بہت جلد مقبول ہو گئے.

۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم کے عہدہ پر آپ کا تقرر ہوا اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی زیر نگرانی ادارۂ اہتمام کے انتظامی امور بطریق احسن نمٹاتے رہے.

۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء کے وسط میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو باقاعدہ دارالعلوم کا مہتمم بنا دیا گیا اور پھر تا دم آخر آپ اسی منصب جلیلہ پر فائز رہے.''

اس کے بعد مولانا عبیداللہ صاحب نے حضرت قاری صاحب کے علمی مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ......

''حضرت جب کسی موضوع پر گفتگو فرماتے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ پورا کتب خانہ ہی حضرت کے سامنے کھلا پڑا ہے. ہر بات قرآن و حدیث اور فقہ کے حوالے سے فرماتے. مجھے بہت کم یاد ہے کہ حضرت نے کبھی کوئی بات حوالے کے بغیر کی ہو. یہی وجہ ہے کہ حضرت کی زبان مبارک میں بڑی کشش اور تاثیر ہوتی تھی.

امام رازی و غزالی کے علوم و معارف کے تو حافظ تھے. اسکے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم پر بھی گرفت خوب مضبوط تھی. دارالعلوم دیوبند میں ایک طویل مدت تک حجۃ البالغہ کا باقاعدہ درس دیتے رہے. اس درس کی شان یہ ہوتی تھی کہ اس وقت دارالعلوم کے بڑے بڑے اساتذہ کرام اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے. حضرت قاری صاحب اس طرح اس کی تشریح و توضیح فرماتے کہ سبحان اللہ بے ساختہ ہر ایک کی زبان سے نکلتا تھا.''

مولانا عبیداللہ صاحب نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تبلیغی اور

دعوتی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ......

''حضرت قاری صاحبؒ نے پاک وہند کے علاوہ بیرونی دنیا میں جو تبلیغ دین کا کام انجام دیا وہ ہر شخص جانتا ہے. خود فرمایا کرتے تھے کہ الحمدللہ ثم الحمدللہ افریقہ وغیرہ میں ہزارہا کی تعداد میں لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس فقیر کے مواعظ سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا ہے.

اندریں سلسلہ ایک عجیب وغریب واقعہ بھی بیان فرمایا جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

ایک دفعہ آپ افریقہ کے دورے پر تھے. وہاں چند مخلصین نے درخواست کی کہ حضرت آپ کو یہاں کے مشہور تاریخی مقامات دکھائے جائیں. حضرت نے فرمایا بہت اچھا. چنانچہ یہ حضرات حضرت کو لے کر سب سے پہلے وہاں کی مشہور یونیورسٹی میں گئے. وہاں اتفاقاً طلبا کا جلسہ ہورہا تھا. یہ وہ دور تھا جب وہاں گورے اور کالے کی تفریق چل رہی تھی. اس میں لڑائی جھگڑا ہورہا تھا. کالے گوروں کو اور گورے کالوں کو برداشت نہیں کرتے تھے.

حضرت کا فرمانا ہے کہ جب میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تو وہاں استقبال کرنے والوں نے یہ سمجھ کر کہ شاید یہ بھی مدعوئین میں سے ہیں ہمارا استقبال کیا اور سیدھے وہاں پہنچا دیا جہاں جلسہ ہورہا تھا. جب ہم وہاں پہنچے تو اسٹیج پر تین کرسیاں تھیں. ایک صدر کی ایک نائب صدر کی اور ایک سیکریٹری کی. سیکریٹری خاتون تھیں. ہمیں دیکھ کر یہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے وہاں بیٹھنے کو کہا. اب تعارف ہوا اور انھوں نے یہ اعلان بھی کردیا کہ ہندوستان کی مشہور یونیورسٹی دیوبند کے چانسلر آئے ہیں یہ آپ کے سامنے کچھ بیان کریں گے.

حضرت فرماتے ہیں کہ مجھے اس پر تشویش ہوئی کہ نہ مجھے اس جلسہ کی غرض وغایت کا علم ہے اور نہ ہی ذہن میں کچھ ہے. اب کیا بیان کروں. فرماتے ہیں کہ اللہ

تعالیٰ نے فوراً ہی دل میں یہ ڈال دیا کہ یہاں فضیلت علم بیان کی جائے. چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان حضرات سے سوال کیا کہ آپ کو یہاں کس چیز نے جمع کیا ہے. اگر آپ کہیں کہ وطن نے تو میں کہوں گا یہ اس طرح ٹھیک نہیں کہ میرا وطن ہندوستان ہے اور آپ کا افریقہ. سیکڑوں میل کا فاصلہ ہے. اگر آپ کہیں کہ رنگ نے تو یہ بھی خلاف مشاہدہ ہے کہ میرا رنگ کچھ گورا ہے اور آپ کا سیاہ ہے. اگر آپ کہیں کہ قومیت نے تو وہ بھی ایسی نہیں. آپ کی قومیت اور ہے میری اور. اگر آپ کہیں مذہب نے تو وہ بھی ایسا نہیں. آپ کا مذہب اور ہے میرا مذہب اور ہے. اور پھر کس چیز نے جمع کیا...... فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ سوال کیا تو وہ سارے میرا منھ تکنے لگے کہ یہ کیسا سوال ہے اور سائل کون ہے؟ پھر میں نے خود ہی عرض کیا کہ ہمیں جمع کیا ہے علم نے. آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور کیا کہنے والا ہوں. اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کیوں اور کیسے اور کس لئے جمع ہوئے ہیں.

حضرت فرماتے ہیں کہ پھر میں نے قرآن وحدیث سے علم کی فضیلت بیان کی اور پھر یہ عرض کیا کہ ہمارے مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ گورے اور کالے میں کوئی فرق نہیں. اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ معزز اور محترم ہے جو متقی ہو، پرہیز گار ہو.

فرماتے ہیں کہ جب میرا وعظ ختم ہوا تو سیکڑوں کی تعداد میں طلبا اور سامعین رو رہے تھے. اس وعظ کا اثر یہ ہوا کہ گوروں نے کالوں کو اور کالوں نے گوروں کو گلے لگالیا اور پھر ان میں سے ایک بڑی تعداد نے اسلام بھی قبول کرلیا......

بہر کیف حضرت قاری صاحبؒ روشن دلانِ دیوبند کے لعل شب چراغ تھے جس سے یہ گھر تمام آفتاب ہوگیا.

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں
ایک طلوع آفتاب دشت و چمن سحر سحر

۵

دارالعلوم حقانیہ پاکستان کے شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ......

''حضرت بانی دارالعلوم کے علوم وکلام، تصانیف و بیانات کو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ خوب سمجھتے اور حضرت قاری صاحبؒ خوب بیان فرماتے تھے. اس لحاظ سے آپ واقعی قاسم العلوم والخیرات ہیں اور یہ خصوصیاتِ دارالعلوم میں صرف دو تین شخصیات کی رہین منت ہیں کہ ایک قصبے کا مدرسہ عربی اسلامی دارالعلوم مرکز علوم عالم اسلام کی سب سے جلیل القدر عربی و دینی یونیورسٹی بن گیا. جس کی مثال عالم اسلام میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی، ان میں اول ذاتِ محمود شیخ الہندؒ اسیر مالٹا کی تھی. دوسری عظیم المرتبت وجاہ شخصیت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی مسلمہ ذات ہے. جنھوں نے اٹھارہ سال مدینہ پاک کے قیام میں چودہ سال احادیث رسولؐ کا درس روضۂ اطہر کے سامنے دیا. جن کے دورِ صدارت و نظامت تعلیمات میں دارالعلوم پروان چڑھا. تیسری ذات ستودہ صفات جامع الکمالات والمحاسن حضرت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مرحوم ومغفور کی تھی جن کے دورِ اہتمام و ادارت و نظامت میں دارالعلوم بین الاقوامی شہرت اختیار کرتے ہوئے بین الاقوامی یونیورسٹی بن گیا اور دنیا کے لئے قابل رشک جامعہ ثابت ہوا. دارالعلوم دیوبند خود ایک ایسا

ادارہ ہے جہاں سے ایسے افراد پیدا ہوئے جو اپنی ذات میں خود انجمن تھے. جن میں حضرت قاری صاحب کا ایک طیب و اطیب وجود مسعود ہے جو خود ایک ادارہ تھے انجمن تھے. **کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء.** حضرت قاری صاحب کے دورِ اہتمام میں چودہ طبقات علمی دارالعلوم میں پیدا کیئے گئے.

(۱) مفسرین قرآن حکیم و مترجمین قرآن حکیم (۲) محدثین عظام (۳) مفتی و فقہاء کرام (۴) متکلمین اسلام (۵) معلمین و اساتذۂ علوم و فنون (۶) مصنفین و مورخین (۷) مبلغین دین (۸) مناظرین اسلام (۹) مجاہدین و قائدین ملت (۱۰) ائمہ سلوک حضرات مشائخ عظام و اولیاء کرام (۱۱) قراء حفاظ کرام (۱۲) ناظمین و ممتحسین و مدیران (۱۳) صحافی و اہل قلم (۱۴) ادبا و شعراء اطبا و حکما. ان طبقات کے علوم و فنون سے حضرت قاری صاحبؒ نے اپنے ظرف عالی کے مطابق بہت کچھ حاصل کیا اور اس لحاظ سے جامع شخصیت صرف قاری صاحب کی تھی.

ولیس علی اللّٰہ بمستنکر

أن یجمع العالم فی واحد

(اللہ تعالٰی کے لئے ناممکن نہیں کہ...... ایک عالم کو ذات واحد میں جمع کر دے)

۶

لاہور کی شاہی مسجد کے امام مولانا سید عبدالقادر آزاد نے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی وفات پر روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ایک مضمون تحریر کیا تھا. جس میں حضرت قاری صاحب کی امتیازی خصوصیات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ......

''بہر حال حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو علم و

عمل میں امتیازی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ خطابت کے فن میں بھی کمال حاصل تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد جن لوگوں نے شریعت کے اسرار و رموز اور بلند فکر معانی کی تشریح و تعبیر میں نام پیدا کیا ان میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو بھی خاص مقام حاصل تھا. حضرت کوئی ساٹھ برس تک دار العلوم دیوبند کے مہتمم اور چانسلر رہے اور اس دوران میں بیش بہا علمی تصانیف و تالیف کا ذخیرہ مہیا کیا۔''

ے

دار العلوم حقانیہ کے مولانا سمیع الحق صاحب پاکستان کے سرکردہ علماء میں شمار ہوتے ہیں. انھوں نے اپنے رسالے ماہنامہ الحق اکوڑا خٹک ضلع پشاور، شمارہ شوال ۱۴۰۳ھ میں مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ......

''ان کی ذات میں تمام اکابر و اساطین دیوبند کی نسبتیں جمع تھیں اور وہ زندگی بھر اپنی حسبی و نسبی گوناگوں خصائص و کمالات کی وجہ سے ان تمام اکابر کے محبوب بن چکے تھے.

ایک مرحلہ ایسا آیا کہ شاید آپ دار العلوم دیوبند چھوڑ کر پاکستان سکونت اختیار کر لیتے. ادھر اکابر دیوبند باصرار آپ کو دوبارہ کھینچ لائے تو استقبالیہ تقریب میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے دیدۂ پرنم اور گلوگیر آواز میں ان کو مخاطب کر کے فرمایا......

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

بلاشبہ ان کی ذاتِ محبوبیت میں تماشا گاہِ عالم تھی. وہ اس گلشن علم و معرفت کے مالی اور شجرۂ طوبیٰ کے امین تھے جس کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی. جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ڈالی اور جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مجاہد اعظم مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے عمائدین امت نے اپنی زندگی تج دی.

یہ امانت جب آپ کے ہاتھوں آئی تو پون صدی کی طویل اور صبر آزما شبانہ روز جدو جہد خداداد اہلیت و صلاحیت، اخلاص و دیانت اور والہانہ جہد و عمل کے ساتھ آپ نے اس مدرسۂ علم کو ایک ایسے جامعہ میں تبدیل کر دیا جس کے انوار و تجلیات سے ایک عالم جگمگا اٹھا اور وہ اس امانت سے الگ ہوکر جب دنیا سے رخصت ہوئے تو دیوبند کا وہ سرچشمہ علم علوم نبوت کا ایک بحر زخار بن کر علم و دانش کی پوری دنیا پر اپنی برتری اور فضیلت کا لوہا منوا چکا تھا.

اس کے بعد مولانا سمیع الحق صاحب نے قاری محمد طیب صاحب کے کمالات اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ......

''حکیم الاسلام نسبی اور روحانی رشتوں کے ساتھ ساتھ علم و حکمت کے لحاظ سے اپنی ذات سے بھی ایک انجمن تھے. ان کے علوم و تصانیف اور خطبات حکمت ولی اللّٰہی اور معرفت نانوتویؒ کے ابلتے ہوئے سرچشمے ہوتے تھے. اسرار دین کی تشریح اور شریعت کی ترجمانی میں ان کا شمار گنے چنے حکماء اسلام میں ہوسکتا ہے. ان کی ہر تقریر حقائق و معارف کا ایک سمندر اور ہر تحریر اسرار و نکات کی ایک دنیا اپنے اندر لئے ہوئے تھی...... ان کے خطبات سے نہ صرف برصغیر کا گوشہ گوشہ بلکہ عالم اسلام کے علاوہ افریقہ اور یورپ کی دور دراز بستیاں بھی مستفید ہوئیں اور مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی

آواز پہنچانے میں زندگی کا اکثر حصہ طویل اسفار کی نذر رہوا.

اسلام کے اہم اور عصر حاضر کے جدید مسائل پر ایک سو سے زائد تصانیف چھوڑیں. حدیث و تفسیر اور فن حقائق و اسرار کی کتابیں اکثر زیر درس بھی رہتیں. دعوت و بیان کا انداز حکیمانہ، تصنیف و تالیف کی شان فلسفیانہ ہونے کے باوجود شعر و سخن کا بھی اعلیٰ ذوق اور ثقہ انداز رکھتے تھے. ان کی مثنویاں، قصائد اور فصیح و بلیغ نظمیں اعلیٰ ترین ذوقِ سخن کی غمازی کرتی ہیں.

الغرض وہ اپنے جامع الصفات اکابر و اسلاف کے کمالات و محاسن، نجابت و سعادت، شرافت و تمکنت، فکر و اصابت، تواضع و متانت کا ایک پیکر جمیل اور دیوبند کی اعلیٰ روایات کا ایک مرقع اور ظاہری لطافت و نظافت اور حسن و پاکیزگی کا ایک مجسمہ تھے.''

۸

مولانا محمد یوسف لدھیانوی پاکستان کے ذی وقار اور عالی قدر علماء میں سے تھے...... بنوری کے مدرسہ سے آپ کا تعلق تھا. افسوس ہے کہ وہ کراچی ہی میں جام شہادت نوش کر چکے ہیں. ماہنامہ بینات کراچی میں انھوں نے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی وفات پر ایک مختصر مگر جامع مضمون تحریر کیا تھا. مولانا نے لکھا تھا کہ......

''۶/شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء بروز اتوار حضرت اقدس حکیم الاسلام مولانا الحاج الحافظ القاری محمد طیب قاسمی ۸۸/سال کی عمر میں عالم فنا سے عالم بقا کی طرف رحلت کر گئے. انا للہ وانا الیہ راجعون.

حضرت حکیم الاسلام مرحوم کی عبقری شخصیت گوناگوں فضائل و کمالات کا مجموعہ تھی. وہ اپنے دور کے بہترین قاری، جید حافظ، صاحب کمال عالم، قوی النسبت شیخ طریقت، بے بدل خطیب، صاحب طرز ادیب، نامور متکلم، نکتہ رس فلسفی، قادر الکلام

شاعر، کامیاب مدرس اور شگفتہ قلم مصنف تھے. حکمت قاسمی کے شارح اور روایات سلف کے امین تھے.

حضرت مرحوم، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے تھے. ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۸ء میں عالم وجود کو رونق بخشی. اہل اللہ کی آغوش محبت میں پھلے پھولے. قاعدہ بغدادی کی بسم اللہ سے لے کر علوم عالیہ کی تکمیل تک سب کچھ دارالعلوم میں ہی پڑھا. دارالعلوم کے اس دور کے خضر صفت اساتذہ نے نہایت محبت وشفقت اور محنت وتوجہ سے پڑھایا. حدیث میں حضرت امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ سے تلمذ تھا.

۱۳۳۷ھ ۱۹۱۸ء میں سند فراغت حاصل کی اور دارالعلوم ہی میں حسبۃً للہ تدریس کی خدمات انجام دینے لگے. ۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء سے ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء تک اپنے اکابر کی موجودگی میں دارالعلوم کے نائب مہتمم رہے اور ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء سے مہتمم کے منصب پر فائز ہوئے. قدرتِ فیاض نے انہیں حسن و جمال اور فضل وکمال کے ساتھ ساتھ عقل و دانش، فہم وفراست، حلم و وقار، حسن تدبیر اور نظم ونسق کی بے پناہ صلاحیتیں بھی عطا فرمائیں تھیں.

حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی مالٹا سے تشریف آوری پر ان سے بیعت ہوئے اور ان کے وصال کے بعد حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے سلوک کی تکمیل کی اور خلافت واجازت سے مشرف ہوئے.

حضرت مرحوم کا عظیم الشان کارنامہ تقریباً ساٹھ برس تک مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی انتظامی خدمات ہیں. صرف دارالعلوم کی تاریخ ہی نہیں بلکہ دیگر اداروں میں بھی اتنی طویل مدت تک منصب اہتمام پر فائز رہنے کی مثالیں شاذ ونادر ہی ملتی ہیں.

جشن صدسالہ کے بعد بعض خفی و جلی اسباب کی بنا پر

دارالعلوم میں خلفشار کی صورت پیدا ہوئی اور حضرت مرحوم کے لئے اپنی پیرانہ سالی اور ضعف وعلالت کی وجہ سے اس کا سنبھالنا ممکن نہ تھا. اس لئے عمر کے آخری دو سال دارالعلوم کے اہتمام اورنظم ونسق سے لاتعلق رہے. مگر آپ کا روحانی وقلبی تعلق دارالعلوم سے بدستور قائم رہا اور ہمیشہ دارالعلوم کیلئے خیر طلب اور دعا گو رہے اور وصیت فرمائی کہ آپ کی نمازِ جنازہ دارالعلوم کے احاطہ میں ہو.

حضرت کی صحت کافی عرصہ سے مخدوش چلی آرہی تھی اور ایک سال سے تو قریباً صاحب فراش تھے. بالآخر وہ وقت موعود آپہنچا جس سے کسی فرد بشر کو مفر نہیں. انا للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطی و کل عندہٗ باجل مسمیٰ. حضرت کی وفات حسرت آیات اہل حق کے لئے عظیم سانحہ ہے. حق تعالیٰ شانہٗ مرحوم کو درجات عالیہ عطا فرمائیں اور تمام متعلقین اور پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائیں. آمین.

۹

وقف دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی صاحب علم بھی ہیں اور صاحب قلم بھی...... پھر خود ان کی اپنی نسبت اتنی بلند ہے کہ محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے صاحبزادے ہیں. میں نے بہت تھوڑی سی عمر میں ان کی طالب علمی کا آخری دور بھی دیکھا ہے جب مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب کو حیدر آباد سے بلاکر جمعیۃ الطلبہ کا ناظم بنایا گیا اور ایک خاص علمی ماحول طلبا میں پیدا ہونے لگا. تقریر وتحریر کا ذوق ابھرنے لگا. طالب علمی کے زمانے سے مولانا انظر شاہ صاحب نہایت ممتاز تھے...... سعدی شیرازی کے الفاظ میں......

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

پھران کا تدریسی دور رہا اور ان کے علم کے چرچے ہر سو ہونے لگے. درس و تدریس کے ساتھ تقریر وتحریر کا کمال پھران کی بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی اور بڑے بڑے مسئلوں کو ہنسی ہنسی میں حل کر دینا یہ تمام خوبیاں ایک شخص میں کم ہی جمع ہوتی ہیں ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے بارے میں ان کا مضمون پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت قاری صاحب ہماری آنکھوں کے سامنے چل پھر رہے ہیں. لفظوں میں کسی کی شخصیت کی تصویر کشی اس سے بہتر شاید ہی ہو سکے. مولانا انظر شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں......

''کس قدر خوش نصیب ہے وہ انسان جسے حسب و نسب کی شرافتیں، گھر کا پاکیزہ ماحول، شریف الطبع والدین، ظاہر و باطن کی تربیت، علم و تعلم کے لئے یگانۂ روزگار شخصیتیں ملی ہوں. واقعی اس سے بڑھ کر کوئی سعید اور جس کے حصے میں یہ سب امتیازات ہوں اس سے بڑھ کر کوئی بخت آور نہیں.

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو یہ سب سعادتیں لگے بندھے انداز میں نہیں بلکہ وافر میسر تھیں. ان کی ددھیال میں حضرت نانوتویؒ کا نام نامی کافی ووافی ہے. ننیھال دیوبند کی ایک شریف بلکہ اشرف خانوادہ، گھر کا ماحول علمی، تعلیم اور تعلم کا سلسلہ فخر روزگار شخصیتوں تک پہنچتا ہے. روحانی تربیت کے لئے مجدد وقت سے وابستگی، خود طبعاً شریف، حلم کے پیکر، بزرگانہ اداؤں کا مرقع.''

مولانا انظر شاہ صاحب نے بالکل صحیح فرمایا ایسے خوش نصیب کم ہی ہوتے ہیں جن کو یہ ساری نسبتیں اور شرافت ونجابت کی سعادت حاصل ہو جائے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ واقعی خوش نصیب انسان تھے. ان کا پورا سلسلہ اور گھر کا ماحول دینی اور علمی تھا.

اس کے بعد مولانا نے لکھا ہے کہ تعلیم کے زمانے میں انہیں بہترین اساتذہ اور مربی میسر آئے۔ فرماتے ہیں کہ......

''شعور نے آنکھ کھولی تو یہ عصر دارالعلوم کا خیر القرون تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی اگرچہ بینائی جاتی رہی تھی تاہم حیات تھے۔ بارہا اپنے سینہ بلکہ معرفت وعرفان کے گنجینہ سے مہتمم صاحبؒ کو مس کیا۔ شیخ الہندؒ کا دست شفقت سر پر رہا۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے ابتدائی اسباق لئے۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے بڑا وقت آپ کی تعلیم کے لئے صرف کیا اور پھر دارالعلوم جو اس وقت ممتاز شخصیتوں کا کہکشاں تھا ان میں سے ہر ایک افادہ کے لئے سرگرم گویا کہ:

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں
میرا حق ہے فصلِ بہار پر

آخر کار اپنے وقت کے محدث جلیل القدر ابن حجر اور ثانی ابن ہمام علامہ کشمیریؒ کے اتھاہ علم سے سیرابی کے لئے مستعد ہوگئے اور جم کر استفادہ کیا تا آنکہ جس شب میں علامہ اس خاکدانی ارضی کو چھوڑ رہے تھے عصر تا مغرب اپنی معروف کتاب ''مشاہیر امت'' کے لئے بسلسلۂ ابوالحسن کذاب استفادہ فرماتے رہے۔''

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو اپنے بزرگوں سے جو تعلق خاطر تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا انظر شاہ صاحب لکھتے ہے کہ......

''انہیں اپنے بزرگوں سے عشق تھا۔ وعظ ہو کہ تقریر، مجلس ہو کہ مستفیدین کا حلقہ ہر جگہ اکابر کا وقیع تذکرہ فرماتے۔

ہندوستان کی حدوں کو توڑ کر دارالعلوم کا تعارف، بزرگوں کی معرفت انکے اسی معمول کا دلآویز ثمرہ ہے۔ بہت سے گمنام متعارف ہوگئے بہت سے نامور جاوید بن گئے۔''

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نہایت نفیس الطبع انسان تھے. ان کی طبعی نفاست جو لباس میں، گفتگو میں، نشست و برخاست میں ہر چیز میں جھلکتی تھی اس کی وجہ سے بچپن سے ہی حضرت قاری صاحب کے ساتھ بڑی انسیت محسوس ہوتی تھی اور وہی انسیت شعور کے بعد نیاز مندانہ اور عقیدت مندانہ تعلق میں بدل گئی. حقیقت یہ ہے کہ میں دیوبند کے بزرگوں کے بارے میں جو تصور کرتا تھا حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مجھے اس کی تصویر نظر آتے تھے. علم، بردباری اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے چھوٹوں کی دلداری، وہ کوئی بات ایسی نہ کرتے تھے نہ کہتے تھے جس سے کسی دل شکنی ہوتی ہو.

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

مولانا انظر شاہ صاحب رقم طراز ہیں کہ......

''نفاست ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھر گئی تھی. خود نفیس، پوشاک نفیس، گفتگو نفیس، وعظ نفیس، تحریر نفیس، گویا کہ سراپا نفاست، کھانے میں پسندیدہ امر یہ تھا کہ دستر خوان لگا دیا جائے انہیں جو چیز پسند ہوگی خود ہی اٹھا لیں گے. اگر میزبان زبردستی کھلانا چاہتا تو قدرے ترش ہوکر فرماتے کہ بھائی کھانے کا تعلق رغبت سے ہے ترغیب سے نہیں.

ایک دعوت میں مولانا فخر الحسن صاحب مرحوم بار بار رائتہ اٹھا کر پیش کرتے اور کہتے کہ رائتہ. فرمایا کہ جی ہاں رائتہ. غالباً رائتہ مرغوب نہ تھا.

اپنی تحریر کا اختتام مولانا انظر شاہ صاحب نے کرب کے جس احساس کے ساتھ کیا وہ دردمندوں کے دل کو زخمی کرنے کے لئے کافی ہے. انھوں نے لکھا ہے کہ......

''دار العلوم سے آپ کو اس درجہ تعلق تھا کہ میری موجودگی میں ایک صاحب کا تجوید میں تقرر ہوا. کسی نے کان میں چپکے سے کہا کہ امیدوار کا تعلق فلاں گروپ سے

ہے. جھنجھلا کر کہا ''اس سے کیا ہوتا ہے کہ فلاں سے ہے فلاں سے نہیں دیکھنا یہ ہے کہ دارالعلوم کیلئے بھی مفید ہے یا نہیں.

غرضیکہ وہ ایک شجر سایہ دار تھے. جس کے گھنے سائے میں دوست دشمن اپنوں غیروں نے راحت و آسودگی پائی اور جب یہ درخت خشک ہونے لگا تو قافلہ آگ لگا کر آگے بڑھ گیا. خاتمہ عمر میں جس کرب، بے چینی، دل و دماغ کی چبھن، روح اور جسم کی خلش میں ان کو الجھا دیا گیا اگر کوئی ان سے ان کا حال پوچھتا تو وہ کہتے اور اس بیان میں صادق ہوتے ؎

نہ پوچھ حال میرا وہ چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

آخر کار دل کا زخم رستا رہا. جب کوئی بوند باقی نہ رہی تو وہ زبان حال سے یہ کہتے ہوئے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے.

نہ جانے کس بے گناہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اس کے شور بِاَیِّ ذَنبٍ قَتَلْتَنِیْ ہے.

ان کے مرقد کی لوح اگر مجھ سے لکھوائی جاتی تو میں یہ شعر جو صورت واقعہ کا بھرپور عکاس ہے لکھتا ؎

بہ لوحِ تربت یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مظلوم را جُز بے گناہی نیست تقصیرے

''آہ!......ایک ۸۶ رسالہ مقدس زندگی کے ساتھ ظالمانہ کھلواڑ اور ۶۳ رسالہ پرخلوص خدمتِ دارالعلوم کا تلخ تر انعام.''

۹

مولانا سید عبد الرؤف عالی ایک ایسی علمی شخصیت کا نام ہے جن کی فکری صلاحیتیں، بصیرت اور حالات پر گہری نظر ایسی خصوصیات ہیں جو کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہیں...... اگر آپ کو ان کی تالیف ''معارف المشکوٰۃ'' کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے تو آپ کہہ اٹھیں گے کہ اسلوب اور تحریر کی جاذبیت کے ساتھ فکر کی گہرائی، مسائل کا تجزیہ کرنے کی خاص صلاحیت اور اس کے ساتھ اعتدال و توازن سطر سطر سے نمایاں ہے. حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات پر مولانا کا مضمون خاصے کی چیز ہے. مولانا نے اپنے مضمون کا آغاز کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ......

''بعض شخصیتیں اتنی جامع الصفات ہوتی ہیں کہ ان کے کارناموں اور کارگذاریوں پر نظر ڈالنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ زندگی کا کون سا پہلو ایسا ہے کہ جو اس شخصیت کے لئے وجہ امتیاز ہے اور جس کی چھاپ زندگی پر زیادہ ہے. کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ مختلف جہات میں جو کارنامے وجود پذیر ہوتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف اور ممتاز ہوتے ہیں. اس لئے. ان کی نشان دہی بآسانی کی جاسکتی ہے اور ان کی حدود تعین بھی ممکن ہوتی ہے. لیکن بعض افراد ایسی گوناگوں صفات کے حامل اور اتنی مختلف النوع صلاحیتوں سے بہریاب ہوتے ہیں جن کو ایک دوسرے سے الگ کرنا آسان نہیں ہوتا.

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت بھی ان ناقابل فراموش افراد میں شامل ہے جو اپنی ذات سے ایک انجمن ہوتے ہیں اور جن کے فکر و عمل کے دائرے زندگی کے ہر گوشے تک پھیلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں. اس کے ساتھ ساتھ خود ان کی ذات معاشرتی اور جماعتی زندگی سے ایسی مربوط ہوتی ہے کہ جب کبھی ان کی ذاتی زندگی پر نظر ڈالی جاتی ہے اور ان کی خدمات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو

وہ ایک لحاظ سے وقت کی تاریخ کا بھی ایک جائزہ ہوتا ہے۔ وہ ایک فرد ہی کی تاریخ نہیں ہوتی بلکہ اس وقت کے معاشرے اور جماعت کی تاریخ کا بھی بہت کچھ عکس اس میں آجاتا ہے۔"

اسکے بعد مولانا نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کے اس گوشے پر روشنی ڈالی ہے جس کا تعلق ایک خاص لفظ "مہتمم" سے ہے۔ انھوں نے اس لفظ کی ایک خاص تاریخ اور پس منظر بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ لفظ مہتمم بھی دراصل دارالعلوم سے ہی شروع ہوا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

"اس وقت حکیم الاسلام کی شخصیت کے صرف ایک ہی پہلو پر نظر ڈالنا مقصود ہے جو یوں تو ایک خاص دائرۂ کار سے متعلق ہے لیکن حقیقت میں وہ اس جامع الصفات شخصیت کے اس گوشۂ خدمت کا تعارف ہے جس نے انہیں اپنی نسبتوں کے زیر سایہ وہ مرکزی، ملکی اور عالمی حیثیت بخشی جس کی بنا پر وہ دیوبندیت کے واحد ترجمان اور علم دین کے عظیم پاسبان بن گئے۔

اس وقت ہم منصب اہتمام کی بات کر رہے ہیں۔ یہ وہ منصب ہے جو دارالعلوم دیوبند کے آغاز کے ساتھ متعارف ہوا اور جو اپنی اصطلاحی حیثیت میں اس سے قبل معروف نہ تھا۔ اہتمام اور مہتمم کے لفظ اسی وقت سے مدارس کی تاریخ کا جزو لاینفک بن گئے جس کی اولیت کا شرف بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کو حاصل ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں ہوا۔ اس کے قیام کے بعد مدرسہ کے تعارف اور چندہ کی اپیل پر مشتمل اشتہار مدرسہ کی جانب سے پہلی بار شائع ہوا۔ اس میں اس وقت کے بزرگوں حاجی عابد حسین صاحبؒ، حضرت مولانا نانوتویؒ، مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ جیسے متعدد بزرگوں کے نام کے ساتھ

"مہتممان مدرسۂ عربی دیوبند"

کی نسبت ظاہر کی گئی تھی. ایسے اہل دل صاحب نسبت اور باعظمت بزرگوں سے اہتمام کی تاریخ وابستہ رہی ہے. پھر یہ منصب ان ہی حضرات کی سرپرستی اور نگرانی میں بتدریج ایک فرد میں مرکوز ہوتا چلا گیا. اولاً حاجی عابد حسین صاحب پھر مولانا محمد رفیع الدین، منشی فضل حق صاحب، مولانا حافظ احمد صاحب جیسے پاک باز مہتممین سے منتقل ہوتا ہوا حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تک پہنچا. اس کی تجویز سرپرستان مدرسہ میں سے مولانا عماد الدین شیر کوٹی نے رکھی تھی. جس کی تائید مولانا عبدالحق پرقاضوی نے کی اور اس کی تصویب حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے فرمائی.

منصب اہتمام پر فائز ہونے والے حضرات اہتمام دارالعلوم کو اپنی فراست ایمانی، حسن تدبیر، حکمت عملی اور توکل علی اللہ کے ساتھ چلاتے رہے. یہ بلاشبہ اکابر دیوبند کی صف اول سے تعلق رکھتے تھے. ان میں بعض کی قوت علمی بڑھی ہوئی تھی اور بعض کی صلاحیتِ عمل کو فوقیت حاصل تھی. اور بعض علم وعمل کے اس مقام پر فائز تھے کہ ان کا علم عمل سے اور عمل علم سے بازی لے جاتا دکھائی دیتا ہے.''

مولانا عبدالرؤف صاحب نے اپنی اس قیمتی تحریر میں دیوبندیت کے حدود متعین کئے ہیں اور بتایا ہے کہ دیوبندیت کسی نئے مسلک کا نام نہیں ہے...... بلکہ وہ کتاب وسنت کے سرچشمے سے پھوٹنے والے اس فکر وعمل کا نام ہے جس کی مختلف جہتوں کو منضبط کیا گیا ہے. عالی صاحب لکھتے ہیں کہ......

''دیوبندیت اپنے ظاہری وجود میں ایک مدرسہ کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی مگر حقیقتاً وہ ایک فکر اور مسلک ہے جس کی اشاعت و بقا کے لئے کسی لائحہ عمل اور نقشہ کار کی تشکیل لازمی تھی. لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ دیوبند کسی نئے مسلک اور نئے فکر کا عنوان ہے. اس کو سیدھے سادے لفظوں میں ہم یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ دیوبندیت برصغیر کی ہزار سالہ اسلامی تاریخ میں پھیلے ہوئے علم وعمل، شریعت و طریقت، تذکیر وتبلیغ اور اصلاح ودعوت کے ان مختلف حلقوں کو قرآن وسنت اور جمہور

امت کے دائرے میں مربوط اور شیرازہ بند کرنے کا نام ہے جو اپنے اپنے وقت میں حالات کے تقاضوں اور ماحول کی رعایت سے الگ الگ اور جداگانہ انداز میں خدمت دین وملت میں مصروف رہے. پھر انقلاباتِ زمانہ اور اختلاف احوال نے انہیں ایک دوسرے سے بعید کر دیا تھا تاہم جن کے بارے میں یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اخلاص ویقین اور دردمندیٔ ملت کے جذبات سے خالی تھے.

اس ذیل میں دیوبندیت کا بنیادی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مختلف الجہات خدمات کو کتاب وسنت کی معین کردہ حدود اور اہل علم وتحقیق اکابر کے نقوش عمل کی روشنی میں منضبط اور متوازن بنا کر پیش کیا. یہی وہ عظیم خدمت ہے جس نے دیوبند کو وہ مقام امتیاز وقبول عام عطا کیا جس کا اعتراف برصغیر سے لے کر وسطِ ایشیا اور مشرق ومغرب تک تمام اسلامی ملکوں نے کیا ہے.''

مولانا عبدالرؤف صاحب نے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے دورِ اہتمام کا ایک جائزہ لیا ہے......وہ لکھتے ہیں کہ......

''ابتداءً آپ کو انتظامی امور سے طبعاً کوئی دلچسپی نہ تھی، ذہن درس وتدریس اور تقریر وتحریر کی طرف مائل تھا. لیکن اکابر وقت کے اصرار پر اپنے ذاتی رجحان کے برخلاف اس منصب کو قبول کرنا پڑا. مجلس شوریٰ نے اس سلسلہ میں جو تجویز منظور کی اس کے یہ الفاظ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں......

''مولانا موصوف نوجوان، صالح، صاحب علم، عالی خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ آبائی نسلاً بعد نسلٍ سچی اور دلی ہمدردی رکھتے ہیں.'' (تاریخ دارالعلوم صفحہ ۲۷۹)

چنانچہ ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۲ء میں آپ کو نیابت اہتمام کی ذمہ داری سپرد کی گئی اور ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء کے وسط تک یہ منصب آپ کے پاس رہا. ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء میں والد ماجد حضرت حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کا وصال ہو گیا. پھر ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحلت فرما گئے. جو حقیقتاً نظم دارالعلوم کے روح رواں تھے.

اس وقت یہ منصب اہتمام اکابر وقت نے حکیم الاسلامؒ کو تفویض کیا. اس طرح گویا ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء سے ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء تک تقریباً ۵۵ سال منصب اہتمام اور ۱۳۴۱ھ ۱۹۲ء سے ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء تک تقریباً سات سال آپ نیابت اہتمام پر فائز رہے یعنی دارالعلوم کی زمام کار اور نظم و انصرام ۶۲ سال تک آپ سے وابستہ رہا. یہ وہ دور تھا جسے ملک وملت اور خود دارالعلوم کیلئے انقلابات وحوادث کا دور کہا جا سکتا ہے. لیکن خطرات اور ہنگاموں کی اسی آغوش میں دارالعلوم نے برصغیر کے مسلمانوں کے تعلیمی دینی اور ملی مرکز ثقل کی حیثیت اختیار کرلی جس کے نتیجے میں اسے عالمی پیمانے پر تعارف ومقبولیت کا وہ مقام حاصل ہوا جس میں کم از کم دنیائے عرب سے باہر کا کوئی اسلامی ادارہ اس کا شریک وسہیم نہیں ہوسکا.

حکیم الاسلامؒ دارالعلوم دیوبند کے وہ پہلے مہتمم اور ترجمان تھے جنھوں نے دارالعلوم کے لئے بیرونی اسفار کئے. افغانستان، مشرق وسطیٰ کے علاوہ افریقہ، برما، یورپ اور امریکہ کے آپ نے متعدد دعوتی اور تبلیغی دورے کئے. آپ کے دل پذیر مواعظ اور مقبول عام تقاریر کی بدولت جہاں آپ کا حلقہ ارادت وسیع سے وسیع تر ہوا وہیں دنیائے اسلام میں دارالعلوم کی پذیرائی اور عظمت نے اس کو ایک ممتاز اور منفرد مقام بخشا.''

مولانا عالؔی نے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے دور اہتمام میں دارالعلوم کی مختلف جہتوں سے ترقی کا جائزہ لیا ہے اور اس کے لئے ٹھوس اعداد وشمار پیش کئے ہیں. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا دور اہتمام ہر اعتبار سے دارالعلوم کی ترقی کا دور رہا ہے. اس کے بعد انھوں نے اجلاس صد سالہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ......

''دارالعلوم دیوبند نے یوں تو اپنی عمر کے سو سال پورے کرنے سے پہلے جلسۂ دستار بندی کے عنوان سے متعدد بار اپنے فضلاء کو جمع کیا اور اکابر وقت اور اساتذہ کبار

کے ہاتھوں انہیں دستار فضیلت تقسیم کی۔ اس ضمن میں سب سے پہلا اجتماع قیام دارالعلوم کے تقریباً ۷ رسال گذرنے کے بعد ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء میں جامع مسجد دیو بند میں منعقد ہوا۔ جس میں حضرت نانوتویؒ کے نامور شاگرد شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے ساتھ دیگر چار ممتاز فضلاء کی دستار بندی کی گئی جو یقیناً دارالعلوم کے قابل فخر اولین طالب علم تھے۔ اور جنھوں نے اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر دارالعلوم کے فیض کو عام کیا اور اس کی شہرت کو دوام بخشا۔

اس کے بعد ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۵ء، ۱۲۹۸ھ ۱۸۸۰ء، ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۶ء، ۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء، ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء کا جلسۂ دستار بندی دارالعلوم کے دور اول کا عظیم الشان اجلاس تھا جس میں اس وقت کے اعتبار سے دیو بند کی مختصر سی بستی میں باہر سے آنے والے افراد کی تعداد تیں ہزار سے زائد تھی۔ جس میں دور ونزدیک سے آنے والے علماء ورؤسا، اعلیٰ عہدیدار، دیہات کے کاشت کار اور معمولی مزدور تک جس جذبہ اور عقیدت کے ساتھ شریک ہوئے اس کا تصور آج پچاس سال گذرنے کے بعد بہ مشکل کیا جاسکتا ہے۔

وقت کے اکابر اور صلحاء کے اجتماع نے اس جلسہ کی فضا کو جتنا پرتاثیر اور ایمان افروز بنا دیا تھا اس کیفیت کا تذکرہ جلسہ میں شریک ہونے والے لوگ برسوں تک کرتے رہے۔

اس اجلاس کے بعد ملک کے قومی اور سیاسی حالات اور استقلال وطن کی عمومی جدو جہد میں عام طور پر سب کی توجہات کو دوسرے مسائل و معاملات سے بڑی حد تک یکسو رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک اور آزادئ وطن کے بعد اکابر دارالعلوم نے جلسہ دستار بندی کی ضرورت محسوس کی جب کہ اس سے قبل ہونے والے جلسہ دستار بندی کو چالیس سال سے زائد کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی

”صدر المدرسین نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اس کی ابتدائی تیاریاں شروع کر دی گئیں. تاہم مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر وہ اپنی رفتار سے آگے نہ بڑھ سکے. اسی اثنا میں مولانا مدنی ؒ کا سانحہ وفات پیش آ گیا اور اس جلسہ کی تیاری کا کام مزید موخر ہوتا گیا. بالآخر دارالعلوم کے ممبران شوریٰ نے مختلف مجالس میں ساتویں اجلاس دستار بندی کے سلسلہ میں کافی بحث و تمحیص اور گفتگو کے بعد اجلاس کے انعقاد کی تجویز پاس کی اور اجلاس صد سالہ کے عنوان سے اس کو منعقد کرنے کی بات کی گئی. ایک مدت کے بعد یہ اجلاس ہو رہا تھا. دارالعلوم کے ممتاز اکابر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے. بزرگان وقت میں سے حضرت تھانویؒ جیسا کوئی مرجع خاص و عام اور منبع رشد و ہدایت موجود نہ تھا. اگرچہ علمی اعتبار سے اور ملی سطح پر معروف و ممتاز حضرات کا ایک طبقہ ضرور موجود تھا. جس کی ہم نوائی اور تائید و تصویب دارالعلوم کو میسر تھی اور وقت کے لحاظ سے جن کے مخلصانہ اور گراں قدر مشورے دارالعلوم کے مسائل اور معاملات میں مفید و معاون ثابت ہوتے رہے لیکن جماعت دیوبند کی سربراہ کی حیثیت سے کوئی ایسی جامع شخصیت کمیاب تھی جو مختلف جہات، مصالح اور اعتبارات سے جماعت دیوبند کی ترجمان اور قافلہ ولی اللہی اور کاروان قاسمی کا سرخیل قرار دی جا سکتی ہو، صرف حکیم الاسلامؒ کی ذات گرامی ہی کی ایک شخصیت ایسی تھی جو اس منصب کی مستحق کہی جا سکتی تھی اور جس کی عزت و تکریم اور احترام و وقار اور تعظیم و اعتبار کا پیمانہ ہندوستان گیر نہیں بلکہ عالمگیر تھا اور جو اپنی حسبی اور کسبی صلاحیتوں اور فضیلتوں کے ساتھ نسبی اعتبار سے بھی اس گلشن قاسمی کے ایسے پاسبان کہے جا سکتے تھے جو ظاہری اور باطنی لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کے اس اجلاس صد سالہ کو اس کے شایان شان منعقد کرا سکے.

غرض یہ اجلاس بڑی تیاریوں اور بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوا جس کے لئے ابتدائی تیاریاں خانوادۂ قاسمی سے منسلک ایک فرد فرید اور معروف شخصیت مولانا حامد الانصاری غازی مرحوم کی سربراہی میں شروع ہوئیں اور جب مراحل کار کا دائرہ

وسیع ہوا اور اجلاس کی عملی تیاریاں سامنے آئیں تب اگلے مہتمم بالشان مراحل کی تکمیل کے سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ کے صاحب زادے اور خلف اصغر مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی نے یہ ذمہ داریاں سنبھالیں اور ان کی ہوشمندی، حسن تدبیر، سوجھ بوجھ اور مستعدی پر اعتماد کرتے ہوئے ذمہ دارانِ دارالعلوم نے انعقاد جلسہ کے جملہ امور ان ہی کے سپرد کردئے اور کارکنان کی ایک ٹیم ان کے ساتھ مصروف کار رہی.

اس ضمن میں اساتذہ دارالعلوم نے بھی جان توڑ محنت کرکے اجلاس کے مصارف کے لئے ملک کے طول وعرض کے دورے کئے اور بڑی کامیابی کے ساتھ لوٹے اور اسی کے ساتھ ساتھ ادارے کے جملہ چھوٹے بڑے کارکن اپنی اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں جٹ گئے اور مفوضہ فرائض کی تکمیل جی جان سے کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس کو اپنا مقدس فریضہ سمجھ کر انجام دیا. بالآخر حضرت حکیم الاسلامؒ کی سربراہی اور اکابر دارالعلوم کی زیر سرپرستی ادارے کے جملہ وابستگان کی محنت کا ثمرہ سامنے آیا اور اجلاس صد سالہ جس کروفر، جس عظمت وشان کے ساتھ منعقد ہوا وہ تاریخ دارالعلوم کا ممتاز ومنفرد باب ہے.

اس اجلاس صد سالہ میں ہندو بیرون سے ملت اسلامیہ کی نامور اور معروف شخصیتیں شریک ہوئیں اور انھوں نے اس اجلاس میں دارالعلوم کی خدمات کو سنہرے لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا. ۳۰/۳۵/ لاکھ کے اس مجمع نے یہ ثابت کردیا کہ دارالعلوم ملت اسلامیہ ہند کا واحد دینی، علمی اور ملی مرکز ہے جو برصغیر کے تین مختلف جغرافیائی خطوں کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن ہے اور مستقبل میں ان کی امیدوں کا سرچشمہ بھی اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نفسیاتی سہارا بھی. کیوں کہ ہندوستان کی سرزمین آج کے جمہوری دور میں اکثریت کے عزائم ومقاصد، ارادوں اور خواہشات کی بنا پر یہاں کی عظیم مسلم اقلیت کے واسطے ایک زبردست آزمائش گاہ بن چکی ہے.

اس اجلاس نے ایک طرف کئی ہزار فضلائے دار العلوم کو دستار فضیلت عطا کی اور دوسری طرف یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ دار العلوم کا یہ عروج وکمال جہاں دار العلوم قائم کرنے والے اکابر کی دعاؤں کا ثمرہ ہے وہیں حکیم الاسلامؒ کی ان ساٹھ سالہ تابناک خدمات کا حسن اعتراف بھی جنہوں نے صحیح معنی میں مدرسہ عربیہ دیوبند کو ''دارالعلوم دیوبند'' کی حیثیت میں تبدیل کر کے اس قاسمی پودے کو شجر پر بہار بنا دیا جس کے فیض سے سارا عالم سیراب ہو رہا ہے۔''

اجلاس صد سالہ کے بعد جو تکلیف دہ حالات پیش آئے مولانا عبد الرؤف صاحب نے اپنی تحریر میں ان کا بھی جائزہ لیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اجلاس صد سالہ کے بعد اس اختلاف نے طبقہ علماء کی ساکھ کو بری طرح متاثر کیا ہے معاملہ صرف حضرت قاری صاحب کی ذات کا یا ان کے صاحبزادے مولانا محمد سالم صاحب کا نہیں ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نائب مہتمم بننے کے امیدوار تھے۔ بلکہ دار العلوم کی پوری تاریخ اور مسلک دیوبند کا ہے۔

کس نے میرے چند تنکوں کو جلانے کے لئے
برق کی زد میں گلستاں کا گلستاں رکھ دیا

مولانا عالی لکھتے ہیں کہ......

''اجلاس صد سالہ کے بعد دار العلوم کا یہ عروج وکمال قانون فطرت کے تحت ایک دوسرے رخ سے بھی سامنے آیا کہ اس اجلاس کی عظمت وکامیابی اور مقبولیت واثر انگیزی نے جہاں اس گروہ کی نگاہوں میں کھٹک پیدا کر دی جو دار العلوم جیسے عظیم ملی ادارے کو اپنی سیاست بازی کا دیر سے ہدف بنانے کے لئے منتظر بیٹھا تھا تو دوسری طرف اس نے ملک کے صاحب اقتدار طبقہ کی آنکھوں میں بھی چکا چوند پیدا کر دی اور شاید اسے یہ وہم ستانے لگا

کہ جس طرح ایک نحیف ونزار مٹھی بھر ہڈیاں رکھنے والی شخصیت کی آواز پر پورے ملک کے مسلمانوں نے لبیک کہا اور تقریباً ہر براعظم سے اس اجلاس میں آنے والے وفود نے یہی تاثر دیا کہ یہ آواز نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو بلکہ پورے برصغیر میں بسنے والی ملت اسلامیہ کو حتیٰ کہ عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی ایک چھوٹی سی بستی میں اس طرح جمع کر سکتی ہے اور یہ اجتماع آئندہ کسی وقت شاید کچھ مفروضات کی بنا پر اس کے نزدیک تشویش ناک بن سکتا ہے حالاں کہ یہ خالص مذہبی اور دینی تعلق سے آنے والوں کا اجتماع تھا اور اس طرح کا خیال یا نزاکت احساس کا نتیجہ ہو سکتا ہے یا شدید بدگمانی کا جو مختلف اسباب کی وجہ سے اجلاس صد سالہ ہی کے دوران ایسے گٹھ جوڑ وجود میں لائے گئے جو دارالعلوم کو اپنی ڈگر سے ہٹانے، اس کی مسلمہ حیثیت کو مجروح کرنے، اس کی مرکزیت میں رخنہ ڈالنے اور اس کے استحکام وترقی کی راہیں بند کرنے میں معاون بن سکیں۔ اس طرح کی سازشیں اس ہوشیاری اور اس پرفریب انداز سے کی گئیں کہ دارالعلوم کے نظم وانصرام سے متعلق اہم افراد کو ذہنی اور فکری اعتبار سے بڑی حد تک متاثر اور ملفوج کر دیا گیا اور ایسی ایسی شخصیتیں جن کے نام اور کام کو گوناگوں اسباب کی بنا پر معتبر تصور کیا جاتا تھا اور جن کی شخصیتوں کو صاحب اعتبار خیال کیا جاتا تھا وہ بھی بڑی حد تک اس فریب کا شکار ہو گئیں اور اپنی سادہ لوحی یا اپنے حاشیہ نشینوں کی وسوسہ اندازیوں کی بدولت حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی بجائے پیدا کردہ غلط فہمیوں، بدگمانیوں اور تلبیس

میں مبتلا ہوگئیں نیز اخباری اور صحافتی پروپیگنڈے سے اچھے اچھے افراد غلط اندیشیوں اور بدگمانیوں میں گھر گئے. حتیٰ کہ نزاع وشقاق کی وہ جنگ برپا ہوئی جس کی وجہ سے دیوبند کا پورا طبقہ ایسے اندھے فتنے سے دوچار ہوگیا جس میں گویا احادیث میں پیش آمدہ پیشن گوئیوں کے مطابق طعن وتشنیع، یادہ گوئی، الزام تراشی کے تیر اس طرح چلائے گئے کہ بعض اوقات یہ تمیز کرنا مشکل ہوگیا کہ تیر چلانے والا حقیقتاً کون ہے اور جس نشانہ پر تیر چلایا ہے وہ کون ہے؟

المناک بات یہ ہے کہ جدال واختلاف کی راہ پر چلنے والے اتنے بڑے ملی ادارے کے اندر طبعی طور پر کچھ جزوی اور انفرادی خرابیوں کی نشان دہی اور ان کے نقصانات کا پروپیگنڈہ کرنے میں اتنے شدومد سے مصروف ہوگئے کہ اس سامنے کی حقیقت کو نظر انداز کردیا گیا کہ یہ شخصی، وقتی اور جزوی کمزوریاں اگر ہیں تو ان کے تدارک اور تلافی کی صورتیں منصب اہتمام کو مطعون کرنے اور ملزم قرار دینے سے پیدا نہیں ہوسکتیں بلکہ ان کا دوسرا منفی نتیجہ جو برآمد ہوسکتا تھا اور جو ان کے سامنے بھی آگیا اور دنیا نے بھی اسے دیکھ لیا ان معترضین ومخالفین کے طرز عمل سے ان کی مزعومہ خرابیاں یا مفروضہ کوتاہیاں اگر کچھ دور بھی ہوئیں تو اس کی وہ قیمت ادا کرنی پڑی جسکو چکانے کیلئے جماعت دیوبند کی ایک سو سالہ ساکھ دے کر پیچھا نہیں چھٹا اور دیوبند کو اپنے اس مقام اور ساکھ کو حاصل کرنے میں شاید اگلی ایک صدی صرف ہوجائے.

۱۰

مولانا محمد اسلام قاسمی (وقف) دارالعلوم دیوبند میں حدیث وادب کے استاذ ہیں. صاحبِ بصیرت عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ قلم بھی ہیں. انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جو ندائے دارالعلوم ستمبر ۱۹۹۴ء کے شمارے میں شائع ہوا

ہے، بڑے جامع انداز میں ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی تحریک کا جائزہ لیا ہے اور اس تحریک کے آگے بڑھانے میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات کا اور اس مقصد کو آگے لے جانے میں مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے جو اہم خدمت انجام دی ہے، اس کا تذکرہ کیا ہے......مولانا موصوف لکھتے ہیں کہ......

برصغیر ہند میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی، ان کے دین و عقائد، عبادت گاہوں اور تہذیب و تمدن کو تحفظ حاصل رہا، مغلوں کے دورِ حکومت میں خاص طور پر اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے دور میں دینی علوم، تفسیر و حدیث اور فقہ کو عروج ملا، حکومت کی نگرانی میں بھی علوم دینیہ کے نشر و اشاعت کو فروغ ملا، مگر جب مغل دور حکومت کے آخری ایام میں خود حکومتیں متزلزل رہیں اور آپسی اختلافات یا اقتدار کی جنگ میں حکمراں طبقے کے افراد اور حکومت غیر مستحکم ہو گئے اور اتنے بڑے ملک کا نظم و نسق بھی ان کے تسلط سے باہر ہو گیا اور خارجی ریشہ دوانیاں اور سازشیں جڑ پکڑنے لگیں، تب اسلامی علوم و فنون کی حفاظت اور دینی علوم کی نشر و اشاعت حکومت کی سرپرستی سے نکل گئی، بااثر افراد یا اصحاب ثروت مسلمانوں کے طبقے نے علماء دین اور علوم دینیہ کی سرپرستی کا ذمہ سنبھالا، دوسری طرف دہلی میں قرآن و حدیث کی اشاعت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادے کے مخلصانہ جد و جہد سے عام ہوئی، اور تعلیم و تدریس کا یہ سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔

پھر جب برصغیر پر برطانوی استعمار کا تسلط ہوا تو محبِّ وطن جانبازوں کے ساتھ علماء دین نے بھی حکومت کے خلاف بغاوت اور آزادیٔ وطن کی جد و جہد میں مکمل حصہ لیا، اگرچہ ان افراد اور جماعتوں کی یہ کوشش ۱۸۵۷ھ میں اس حد تک ناکام ہوگئی کہ انگریزوں نے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کر لی، لیکن جد و جہد آزادی کے جذبے کو ختم نہ کر سکی، حالات کو دیکھتے ہوئے استعماری حکمرانوں نے اپنی تہذیب و تمدن، علوم و ادب اور طریقۂ معاشرت کو ہندوستانی عوام اور خاص طور پر مسلمانوں پر

مسلط کرنا شروع کر دیا، مسلمانوں کو اپنی بقاء کے ساتھ دین کی حفاظت وعلوم دینیہ کی اشاعت کے سارے راستے مسدود نظر آنے لگے.

اس لئے ان نظریاتی افکار کے خاتمے اور دین وعقائد کی حفاظت کیلئے علماء کی ایک جماعت نے دینی تحریک کا ایک نیا انداز شروع کر دیا، یہ تحریک دراصل برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بن گئی، اس تحریک کی علامت تھی، پورے ملک میں دینی مدارس کا قیام اس تحریک کے روح رواں وہ افراد تھے، جنھوں نے شاہ عبدالغنی مجددی علیہ الرحمہ سے علم حدیث حاصل کیا تھا. اس تحریک کی ظاہری ابتدا ''دیوبند'' کے ایک عربی مدرسہ کی بنیاد سے ہوئی، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے رفقاء علماء دین کی ایک منتخب جماعت کے ساتھ اس کی بنیاد رکھتے ہوئے یہ باور کرا دیا کہ علوم دین، عقائد، تہذیب اور اسلامی شعائر کی بقا اور اس کی اشاعت کے لئے اس طرح کی دینی درسگاہیں انگریزی علوم وتہذیب کا مقابلہ کریں گی دوسری طرف عصری علوم وتہذیب سے مزین ہو کر ارباب اقتدار کے شانہ بشانہ چلنے کی تحریک علی گڈھ سے شروع ہوگئی، جس کے میر کارواں سر سید احمد خاںؒ تھے.

دیوبند کا یہ خالص دینی مدرسہ جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے معروف ہوا دراصل ایک تحریک تھی، جس کا مقصد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادے سے جاری فیضان علم کو باقی و جاری رکھنا اور ہندوستانی مسلمانوں کو مغربی تہذیب اور اس کی خرافات سے محفوظ رکھ کر اسلامی، دینی تعلیم سے آراستہ کرنا تھا. حضرت نانوتویؒ کی مخلصانہ جدوجہد اور حسنِ نیت وعمل سے ادارے نے ترقی شروع کی اور اپنے مقاصد میں اس طرح کامیاب ہوا کہ پوری دنیا کو ہر شعبۂ حیات کے لئے افراد مہیا کئے مفسر قرآن، محدث، فقیہ، مفتی، مؤرخ، حامل شریعت، مصنف، مؤلف، صحافی، ادیب اور مبلغ دین کی صورت میں ایک بڑی تعداد نے تحریک دیوبند کا نام ملک و بیرون ملک روشن کیا.

اس ادارے کے بانیان حضرت نانوتویؒ، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰنؒ اور حاجی عابد حسین جیسے افراد کی نیت کا خلوص تھا کہ خدائی توفیق بھی شامل رہی، چنانچہ اس تحریک کو افراد بھی اس طرح میسر آئے جن کے نام اسلامی تاریخ میں نمایاں ہیں. حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے فیض یافتہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبد الحق مفسر تفسیر حقانیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے نام معروف عالم ہیں.

حضرت نانوتویؒ کا لگایا ہوا یہ پودا ان کے ہی خلف اور جانشین اکابر و حامل علوم و معارف حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے زمانہ اہتمام میں ایک ایسا سایہ دار تناور درخت بن گیا جس کے سائے سے مسلمان مستفید ہوئے اور اس کے ثمر سے پورا عالم فیضیاب ہوا، اس کی شاخیں برصغیر ہند میں اس طرح پھیلیں کہ وہ شاخیں خود ایک تناور درخت بن گئیں.

۱۱

مولانا ابوالحسن علی ندوی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اب ہمارے درمیان نہیں رہے. ہندوستان کے علماء میں ان کی حیثیت بڑی ممتاز تھی...... وہ نہ صرف ہندوستان میں معروف و مقبول تھے بلکہ عالم اسلام میں بھی ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا. مولانا کی بڑی خصوصیات تھیں جس میں ایک خصوصیت ان کی نرم خوئی، تحمل و بردباری اور دوسری صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہئے...... مسلم پرسنل لاء بورڈ کے عاملہ کے رکن ہونے کی وجہ سے مجھے اکثر مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہتا تھا...... ان کی شفقتیں آج بھی یاد آتی ہیں تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں.

مولانا علی میاں صاحب کی خصوصیات کے اعتراف و اقرار کے ساتھ کچھ افسوس یہ ضرور رہا کہ مولانا جیسا آدمی اس طرح ان لوگوں کا ہم نوا بن گیا. جنھوں نے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی مخالفت کی آڑ میں اپنے ذاتی اقتدار کیلئے راہیں ہموار کیں. اگر چہ مولانا علی میاں نے اپنی زبان کو بدگوئی سے اور قلم کو گستاخی سے محفوظ رکھا لیکن ان کا وزن دوسرے پلڑے میں ہونا ہی میرے لئے حیرت کا باعث رہا ہے. بہر حال اس میں شک نہیں کہ مولانا علی میاں صاحب ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے. حضرت قاری صاحب کے بارے میں انھوں نے اپنی تالیف ''پرانے چراغ'' میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے. لکھتے ہیں کہ......

''مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت زمانی رقبہ کے لحاظ سے بھی بہت وسیع اور جامع تھی اور معنوی رقبہ کے لحاظ سے بھی. زمانی رقبہ تو ۸۸/سال کا ہے. جس میں سے ابتدائی زمانہ نکال دیا جائے تو بھی ۷۰/سال کے قریب ہوتے ہیں. معنوی رقبہ اس لئے وسیع کہ علم و فضیلت، بصیرت، وسعت علم اور علم کی پختگی و رسوخ خدمت دین اور اس کے ساتھ اصلاح و وعظ و ارشاد علوم سے رابطہ، تربیت و دعوت و بیعت و ارشاد، ان سب پہلوؤں اور گوشوں پر ان کی زندگی محیط تھی.

واقعہ یہ ہے کہ شاید (کم سے کم ہندوستان میں) کسی علمی و دینی شخصیت کو کم ہی ایسی ہر دل عزیزی عام شہرت و مقبولیت اور مختلف دینی اداروں اور جماعتوں کا اعتماد حاصل ہوا ہوگا جو ان کو حاصل تھا. اس کے ساتھ ان کو طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم و جلیل اور بین الاقوامی شہرت کے ادارہ کی خدمت اور ترقی کا موقع ملا ان کی اس عام مقبولیت اور جامعیت اور ان کی ذات کے اختلاف سے بہت حد تک بالاتر ہونے ہی کا نتیجہ تھا. کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت کے لئے (جو ہندوستان کے مختلف الخیال گروہوں، دینی جماعتوں اور اداروں کا نمائندہ ہے) روز اول سے ان کی وفات کے دن تک ان سے زیادہ موزوں اور متفق علیہ صدر نظر نہیں آیا

اور وہ اس عہدہ پر باتفاق آراء اس کے قیام سے پہلے دن سے وفات کے دن تک صدر رہے.

ان کو نبیرۂ بانیٔ دارالعلوم دیو بند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ہونے کی نسبت گرامی کا شرف حاصل تھا اور وہ نصف صدی تک مسلسل اس موٴقر اور عظیم ادارہ کے منصب اہتمام پر رہے. ان کے اہتمام میں اس ادارہ نے ایسی ترقی کی جو اس کے ابتدائی دور دیکھنے والوں کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی. انھوں نے بڑے بہرانی موقعوں پر اس ادارہ کی حفاظت اور رہنمائی کی انھوں نے اپنا نام اور زندگی اس ادارہ کے نام اور اس کی زندگی سے وابستہ کر دی تھی کہ ان میں ایک کا تصور دوسرے کے ساتھ آتا تھا.

انسان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور سخت سے سخت بات برداشت کرے، راقم نے قاری صاحبؒ کو اس معاملہ میں بہت عالی ظرف اور قوی الارادہ پایا. واقفیت رکھنے والے پورے حلقہ میں یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ قاری صاحب نہایت کریم النفس، بڑے شیریں اخلاق، نرم خو، نرم رو اور نرم گفتگو تھے. اقبال نے جو کہا ہے ؂

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو.

یہ تعریف قاری صاحبؒ پر صادق آتی ہے.

قاری صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کو ایک ہر دل عزیز ادارہ بنایا اور دارالعلوم کو بغیر کسی اختلاف کے عوام سے متعارف کرایا، اور ان کا اس سے تعلق پیدا کیا. تقسیم سے پہلے کئی براعظم کے دورے کئے. تقسیم کے بعد پاکستان بار بار گئے، جنوبی افریقہ کا دورہ کیا. انگلستان گئے اور آخر میں امریکہ گئے.

قاری صاحبؒ عوام کی اصلاح اور وعظ وارشاد میں شیخ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے متبع تھے. حسن تقریر اور دعوتی و اصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا

جس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہنچا، ہزاروں دلوں میں دین کے احترام کا جذبہ اور علماء کے متعلق حسن ظن پیدا ہوا. ایسا خوش بیان مقرر اور واعظ وسیع المعلومات اور نورانی شکل کا عالم مشکل سے دیکھنے کو ملتا ہے. جس پر پہلی نظر پڑتے ہی قلب شہادت دیتا کہ یہ فطرتاً معصوم ہیں. ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ضرر پہنچانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے. ایسے بے ضرر انسان کی اس خوبی یا کمزوری سے لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور عزل و نصب کا بھی وہ نشانہ بن جاتا ہے.

قاری صاحبؒ نہایت متین، باوقار شخص اور تواضع واخلاق کا پیکر تھے. اسی کے ساتھ پرشکوہ اور باوقار بھی. قاری صاحب ندوۃ العلماء کے بھی مقتدر رکن تھے اور اس کے کارکن اور ذمہ داران کے بزرگوں کی طرح احترام کرتے تھے. آخری بار آپ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس میں شرکت کے لئے ندوہ آئے اور تقریر فرمائی. دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا رکن ہونے کی بنا پر بھی راقم کو قاری صاحب سے نیاز حاصل ہوتا رہا اور ہم نشینی کا شرف. بعض مرتبہ ان کو سخت تبصرہ اور تنقید سننی پڑی اور انھوں نے عالی ظرفی اور کریم النفسی کے ساتھ اس کو برداشت کیا. ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک سخت جملہ انھوں نے سنا اور کچھ جواب نہیں دیا. ان کے بعض اہل تعلق سے معلوم ہوا کہ اس کے صدمہ سے ان کو بخار آ گیا.

قاری صاحبؒ خانوادۂ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے چشم و چراغ تھے اور راقم سطور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جن سے مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کا تعلق عقیدت کا نہیں بلکہ عشق کا تھا اور اس کا اندازہ راقم سطور کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی کتاب ''دہلی اور اس کے اطراف'' سے ہوسکتا ہے. جس میں مولانا نے اپنے دیوبند اور گنگوہ کی حاضری اور وہاں کے بزرگوں اور قابل احترام ہستیوں کے سید صاحب کے ساتھ اظہار عقیدت و محبت کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے. قاری صاحب سے وفات سے چند دن پہلے جب

لکھنؤ میں ایک تقریب (جس میں ان کو کسی ادارہ یا مکان کا سنگ بنیاد رکھنے کی زحمت دی گئی تھی) ملاقات و مصافحہ کا شرف حاصل ہوا. مصافحہ کرتے وقت فرمایا کہ کچھ دن آپ کے ساتھ رہ کے بریلی رہنے کو جی چاہتا ہے. وکفی بہ شرفاً

افسوس ہے کہ ۲؍شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء کو انھوں نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا اور اپنے اسلاف کرام سے جا ملے جنکی خدمت دین اور اصلاح مسلمین کی یادگاریں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی ہیں.

وَحَسُنَ اُولٰئِکَ رَفِیْقًا.

مولانا سید ازہر شاہ قیصر محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری کے بڑے صاحبزادے تھے. صاحب نظر ہونے کے ساتھ صاحب قلم بھی تھے. دار العلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ دار العلوم کے ایڈیٹر تھے. مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے بہت قریب رہتے تھے.... کیوں کہ ان کا دفتر ''دفتر اہتمام'' سے بالکل متصل تھا اس لیے قلبی نزدیکی کے علاوہ ہر وقت کا ساتھ بھی رہتا تھا. کیوں کہ حضرت قاری صاحب ان کے استاذ رہ چکے تھے اس لئے بے تکلف اظہار خیال بھی کر لیا کرتے تھے..... مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی وفات کے بعد اپنے ایک مضمون میں انھوں نے حضرت قاری صاحب کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر ایک خاص اسلوب میں روشنی ڈالی ہے. وہ لکھتے ہیں کہ.

''پچھلی تاریخ میں نہیں بلکہ خود اپنے دور اور اپنی زندگی کے رواں دواں اوقات اور اس زندگی کے پیچ و خم کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہو گئی اور انبیاء کی بعثت کا دروازہ بلاشبہ بند کر دیا گیا ہے مگر امت کی سطح پر اب بھی ایسے مصلحین امت، علمائے حق اور قوم و ملت کو زندگی کی نئی تب و تاب بخشنے والے مردان کار دنیا میں آتے

رہے ہیں جن کی قابل تقلید زندگی، بے غرض عمل، علم وعرفان کی گہرائیاں، بابرکت صحبت اور ہمہ گیر تبلیغی اور اخلاقی سرگرمیاں ملت کو ازسرنو زندگی بخشتی ہیں، اس سلسلہ میں امام الدین حنبل ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، خواجہ معین الدین چشتی، سید احمد شہید، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلوی کا نام لینا غلط نہ ہوگا. یہ حضرات بعض اوقات تو امت کی زندگی کے کسی ایک گوشے میں تجدید وتذکیر کا کام کرتے ہیں، بعض وقت اصلاح وتعمیر کے لئے ان کے سامنے امت کی زندگی کے بہت سے شعبے ہوتے ہیں اور وہ سب ہی شعبوں میں اپنی کارکردگی کا اثر چھوڑ جاتے ہیں.

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے تقریباً ۸۷/ برس کی عمر پائی. عمر کے ابتدائی بیس سال چھوڑ کر جو تعلیم اور تربیت کی نذر ہو گئے بقیہ ۶۷/ برس انھوں نے درس و تدریس، تصنیف وتالیف، دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارہ کی تعمیر وترقی، دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کو قرآن وسنت، نبی کریمؐ کے قریب لانے کے لئے ہزاروں میل کے سفر، دن رات دینی مذاکرات، بیعت وارشاد کی لائن پر ہزاروں افراد کی اخلاقی اور مزاجی تربیت اور ملی اداروں میں کام کرنے والے افراد کی نگہداشت میں گذارے.

اس کے بعد مولانا ازہر شاہ قیصر نے حضرت قاری صاحب کی مخصوص عادات، ان کے مزاج کے انداز اور ان کے اوصاف کا ذکر کیا ہے، جس میں خاص طور پر باوجود متمول گھرانے کے ہونے کے ان کے مزاج کی سادگی اور سخت محنت ہر طرح کی مشقت کی برداشت یہ ایسی صفات ہیں، جو کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہیں. شاہ صاحب لکھتے ہیں......

''حضرت مرحوم ایک بے حد مصروف زندگی کے انسان تھے. مزاجاً بھی نفاست پسند تھے کہ ان کے اوپر کی کئی پیڑھیاں خوش حال زمینداروں اور قصباتی رئیسوں کی پیڑھیاں تھیں. اچھا لباس اور گھر کا اچھا ماحول پسند فرماتے تھے. مگر اسی

نفاست پسندی کے ساتھ سخت کوش اور اوقات کے سخت پابند تھے. سفر میں ہر طرح کی صعوبت بآسانی برداشت کرتے تھے. سفر و حضر میں کھانا اگر معمول کے مطابق نہیں ملتا تھا تو کبھی ناگواری کا اظہار نہیں فرماتے تھے. غریب سے غریب انسان کے دستر خوان پر بیٹھ کر انہیں دال بھات کھانے میں کوئی عذر نہ تھا. ان کی خندہ روئی، چہرہ کی مسکراہٹ، لب و لہجہ کی شیرینی، بڑی نرمی اور آہستگی کے ساتھ اصلاحی اقدامات کو آگے بڑھانے کا طریقہ ان کے ارد گرد کے لوگوں کو متاثر کرتا تھا. اصلاح کیلئے ان کا طریقہ سخت گیری کا نہیں تھا بلکہ وہ اپنے ماحول میں اپنے اوقات کے انضباط اور اپنے اخلاق کی مضبوطی سے تغیر پیدا فرماتے تھے. غریبوں کی مالی مدد فرماتے تھے. مگر بہت پوشیدہ طور پر اس طرح کہ لینے اور دینے والے ہاتھ کے سوا اور کسی کو پتہ نہ چلے. امانت کی ذمہ داری کو خوب سمجھتے تھے. اگر کوئی شخص انہیں دس روپے بھی کسی دوسرے شخص کو پہنچانے کے لئے دیتا تھا تو پوری کوشش فرماتے تھے کہ جسے امانت دینی ہے اس تک خود پہنچ کر امانت سپرد کر دیں. نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی ادائیگی میں ان کا غیر معمولی شغف انتہائی طور پر حیرت انگیز تھا مغرب کے بعد چند نوافل میں قرآن کریم کے ایک دو سپاروں کی تلاوت ان کا معمول تھا اور اس معمول کو وہ ہوائی جہاز، ریل، ہوائی اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر بھی پورا فرماتے تھے. مجلس کے اوقات متعین تھے. اس سے زائد وقت مجلس میں صرف نہیں فرماتے تھے. تحریر و تصنیف کی دنیا الگ تھی اور اس دنیا سے بھی ان کی وابستگی دائمی تھی. تقریر کی خوبیاں اور کمالات ان پر نازل ہوتی تھیں. سوتے سوتے بھی تقریر فرماتے اور نیند کی یہ تقریریں بھی انتہائی مربوط، موثر اور منطقی لحاظ سے مکمل ہوتی تھیں. ان کی نیند کی تقریروں کے بہت سے کیسٹ لوگوں کے پاس موجود ہیں. جنہیں سنکر قطعاً اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ بیداری کی تقریریں نہیں بلکہ نیند کی تقریریں ہیں. گھنٹہ گھنٹہ بھر کی پوری تقریر بلند آواز اپنے مخصوص لہجہ میں سوتے سوتے فرما دیتے تھے. اور خود انہیں کوئی احساس نہ ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں''

قیصر صاحب نے حضرت قاری صاحب کے مختلف اوصاف وکمالات کا ذکر کرتے ہوئے بزرگان دین سے ان کا تعلق ان کا ادب واحترام اور اسکے علاوہ ان کے اخلاق اور بردباری ان سب چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ......

اپنے اساتذہ، مشائخ اور بزرگوں کے بیحد مداح، ان کی روایات وکمالات کے عاشق، ان کی بارگاہ میں بیحد مودب تھے. اپنے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے علوم پر غائر نظر تھی جنہیں اپنی سادہ زبان میں اس طرح بیان فرماتے تھے کہ معمولی استعداد کا انسان بھی ان سے مستفید ہوتا تھا. علمی لائن پر اپنے اساتذہ محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بیکران علوم کے قدرداں تھے. حضرت علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ سے تعلق خاطر غیر محدود تھا. جب بھی محدث جلیل کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ ان کے ذکر خیر میں مستغرق ہو جاتے ان کے علوم، ان کے درس اور ان کی ذاتی زندگی کی ایک داستان ان کی زبان پر آ جاتی، سیاست و جہاد میں حضرت شیخ الاسلامؒ کی مردانہ وار سرگرمیوں کے ورق انہیں محفوظ تھے. بعض دفعہ دیر تک حضرت کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے تھے.

منجملہ اور اوصاف کے حضرت مہتمم صاحبؒ کا ایک وصف خصوصی یہ تھا کہ وہ خلوت وجلوت میں کبھی کسی کی غیبت اور برائی نہیں فرماتے تھے.

آگے لکھتے ہیں کہ......

''سیاسی اور انتظامی معاملات میں ان پر مخالفین نے سیکڑوں دفعہ یورش اور یلغار کی. دوسرا کوئی ہوتا تو ان کے صبر آزما الزامات اور بدترین لب ولہجہ سے یقیناً مشتعل ہو جاتا مگر حضرتؒ دار العلوم کی شوریٰ کے جلسوں سے باہر آتے تو ان کے ماتھے پر ایک بھی شکن نہ ہوتی اور انہی لوگوں سے جو خفیہ میٹنگوں میں اچھل اچھل کر ان پر حملے کرتے تھے ان کا لب ولہجہ انتہائی نرم، ادب آمیز اور مشفقانہ ہوتا. ہم لوگ عمر بھر حضرت کے قریب رہے. خلوت وجلوت کے ساتھی رہے مگر بہت سی تلخیوں کا ہمیں

بروقت نہ علم ہو سکا اور نہ احساس. ان ہی تلخ واقعات کی گونج جب کبھی باہر اٹھی تو ہمیں معلوم ہوا کہ فلاں جلسۂ شوریٰ میں فلاں صاحب نے یہ دریدہ ذہنی کی تھی اور فلاں میٹنگ میں فلاں صاحب اس طرح مقابلہ پر آ گئے تھے.

حضرتؒ کی زندگی اپنے کمالات معنوی و ظاہری کے ساتھ بے حد وسیع اور ہمہ گیر ہے. ان کے اخلاق و اعمال، ان کی درس و تدریس، ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف افریقہ، امریکہ، لندن اور ممالک عرب تک ان کے اصلاحی مواعظ، دارالعلوم میں ان کی ۶۰ رسالہ خدمات، دارالعلوم کی علمی اور عملی زندگی کو منتظم کرنے کے لئے ان کی خصوصیات، ان کی دیانت، حلم و بردباری، شرافت طبعی اور شرافت نسبی جمعیۃ العلماء ہند کے تعمیری دور سے ان کی وابستگی اور ان کے بہت سے اجتماعات میں ان کے معرکۃ الآراء خطبات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مذہبی شعور کے احیا کے لئے ان کی خدمات، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں کے شخصی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لئے ان کے قائدانہ کردار، دارالعلوم کا بے مثال صد سالہ اجتماع جو اس کا نقطۂ عروج تھا اور جسے دیکھ کر مسلمانوں کے شاندار مستقبل کا اندازہ کر کے مخالفین نے وہیں سے دارالعلوم کے لئے زوال کے حالات پیدا کئے. اپنے اساتذہ کا احترام اور ان کی اولاد سے ان کا مشفقانہ طرز عمل، طلباء علوم دینیہ پر ان کی لگاتار شفقت، اپنے مخالفین و معاندین سے چشم پوشی کی عادت، ان کے لاتعداد ملکی و غیر ملکی سفر، مسلم لیگ اور کانگریس کے سیاسی نزاعات کے تحریکی دور میں دارالعلوم کے مفاد کی خاطر ان کا محتاط طرز عمل، دارالعلوم کے انتظامی معاملات میں ان کے بے نظیر تدبر اور مدبرانہ حکمت عملی کے صدہا واقعات، نرمی اور شفقت کے ساتھ دارالعلوم کے سیکڑوں افراد پر مشتمل عملہ سے ان کی درسی اور انتظامی خدمات کی تکمیل کرا لینے کا مخصوص طریقہ یہ سب عنوانات حضرت کی صد بہار دامن زندگی کے پھیلے ہوئے گوشے ہیں جن میں سے ہر ایک پر ایک مفصل مضمون لکھا جانا چاہئے. کسی ایک مضمون میں ان سب کا احاطہ ناممکن ہے.

(۲۲)

حرف آخر

اس تحریر کے خاتمہ پر نہایت ادب کے ساتھ چند گذارشات پیش کرنے کی جسارت کرر ہا ہوں.

۱...... اس تحریر میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے جن مخالفین کا تذکرہ آیا ہے.ان میں سے کوئی شخص یا فدائے ملت امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی ان سے میرا کبھی بھی کوئی ذاتی اختلاف نہ رہا ہےاور نہ ہے...... انکے پورے گھر سے ہمارے گھر کے ہمیشہ بڑے خوش گوار تعلقات رہے ہیں اور میں دلی طور پر اس گھر کی اسلئے بھی عزت کرتا ہوں کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ میرے محترم استاد تھے.اور میں نے ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۶ء میں بخاری شریف ان ہی سے پڑھی ہےاوراس زمانے میں بھی حضرت مدنیؒ کی خاص شفقت میرے ساتھ رہی ہے...... اس لئے میری کسی تنقید اور تبصرے کو کسی ذاتی مخاصمت کا نتیجہ نہ سمجھا جائے. میں نے اپنی حد تک جو کچھ سمجھا وہی لکھا ہے.

۲...... حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ ایک آزمائش اور ابتلا تھی. جو اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ پیش آتی رہی ہے.مگر ان واقعات نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ آزمائش کی ان گھڑیوں میں کون حق کا ساتھی ہے.اسلئے یہ آزمائش حضرت قاری صاحب کی ہی نہیں بلکہ پوری جماعت دیوبند کی تھی.

۳...... اتنے سنگین واقعہ کے بعد بھی نہیں لگتا کہ فریقین نے افراد کے استثنا کے ساتھ مجموعی طور پر اس سے کوئی عبرت حاصل کی ہےاور آئندہ کے لئے ان کی روش میں کوئی فرق رہا ہے...... مجھے معاف کریں کہ محسوس یہی ہوتا ہے کہ اخلاص اور للّٰہیت

جو دارالعلوم دیوبند کی اصل روح تھی وہ نکل چکی ہے اور ایک خوب صورت ڈھانچہ ہے جو دیکھنے میں بڑا اچھا نظر آتا ہے مگر بے جان ہے. کہنے کو اب بھی گوشے گوشے سے قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں سنائی دیتی ہیں. رمضان کے آخری عشرے میں اجتماعی اعتکاف کا منظر بھی ایسا ہوتا ہے کہ شاید کسی نے دورِ نبوت میں بھی نہ دیکھا ہو...... لباس تقویٰ کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں...... مگر تقویٰ نہ لباس میں ہے نہ ظاہری صورت میں ہے نہ ھاوھو کی صداؤں میں ہے. وہ تو یہاں سینے میں ہے دل میں ہے. نبیؐ نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ...... **التقویٰ ھھنا التقویٰ ھھنا.**

۴...... ہمیں غور کرنا چاہئے کہ آج یہ درس گاہیں کیوں اپنی افادیت اور معاشرے میں اپنے نفوذ سے محروم ہوتی جارہی ہیں...... ''وائے محرومی احساس زیاں جاتا رہا''......

۵...... دارالعلوم اللہ کی امانت ہے، کسی کی ذاتی ملکیت اور میراث نہیں ہے...... کیا حق پہنچتا ہے کہ اس میں من مانی کی جائے، بے انصافیاں کی جائیں...... ابھی غالباً اکتوبر ۲۰۰۱ء (شعبان ۱۴۲۲ھ) میں ایک بڑا عجیب فیصلہ کیا گیا. یہ فیصلہ بطور مثال ذکر کیا جارہا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ رجسٹرڈ دارالعلوم میں کس طرح کی من مانیاں اور بے انصافیاں ہو رہی ہیں...... محدث دارالعلوم مولانا میاں اصغر حسین صاحبؒ کے صاحبزادے میاں اختر حسین صاحب ایک زمانے تک دارالعلوم دیوبند کے درجہ علیا کے مدرس اور ناظم تعلیمات رہے...... ان کے صاحب زادے حافظ انور حسین دارالعلوم کے درجہ حفظ میں ایک زمانے سے مدرس تھے...... محنتی اور وقت کے انتہائی پابند، اِدھر اُدھر کی باتوں سے الگ صرف اپنے کام میں مشغول رہنے والے، ابھی وہ نہ ضعیف ہوئے اور نہ اتنے معمر کہ اپنے کام انجام نہ دے سکیں ان کو جبری ریٹائرڈ کر دیا گیا...... پالیسی یہ ہے کہ دیوبند اور خاص طور پر یہاں کی

معزز برادریوں کا اور وہ جن کے بزرگوں نے دارالعلوم کی خدمت کی ہے انکا کوئی فرد دارالعلوم میں نہ رہے. بس ہم رہیں اور ہماری چاپلوسیاں کرنے والے...... بے شک دارالعلوم میں لائق اور خوددار و بے باک حضرات بھی ہیں جیسے مولانا سعید پالن پوری وغیرہ ان سے انتظامیہ ڈرتی اور کتراتی ہے کہ کوئی معاملہ کھڑا نہ ہو جائے......

مولانا نانوتویؒ نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ......

''سب دور نزدیک کے رہنے والے جانتے ہوں گے کہ اس مدرسہ کی بنیاد دیوبند والوں نے ڈالی، اس امر میں یہ سب کے امام ہیں ہر چند باہر کے صاحب بھی اس کار خیر میں شریک ہوئے مگر جو کچھ ہے وہ دیوبند والوں کے طفیل ہے''

(تقریر جامع مسجد ۱۹/ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ، ۱۸۷۳ء)

آج چن چن کر ان لوگوں کو باہر نکالا جا رہا ہے. جنھوں نے اس دارالعلوم کو بنایا اور ترقی دی......

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ حرارت نہ معرفت نہ نگاہ

(مفتی) فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی
دارالسلام اسلامی مرکز
مالیر کوٹلہ (پنجاب) ۱۲/شوال ۱۴۲۲ھ ۲۸/دسمبر ۲۰۰۱ء

حوالے

کتاب	مصنف	ناشر/مطبع
قرآن مجید		
صحیح مسلم	ابوالحسن امام مسلم بن الحجاج القشیری	امیریہ بولاق مصر
فتح الباری	احمد بن علی حافظ بن حجر عسقلانی	
تفہیم المسلم	مفتی فضیل الرحمٰن ہلال	دارالمعارف دیوبند
مشکوٰۃ شریف	ولی الدین محمد بن عبداللہ	نور محمد اصح المطابع دہلی
کلیات اقبال	ڈاکٹر محمد اقبال	مکتبہ اسلامی دہلی
سوانح قاسمی	مولانا محمد یعقوب نانوتوی مولانا مناظر احسن گیلانی	دارالعلوم دیوبند
تاریخ دارالعلوم دیوبند	سید محبوب رضوی	دارالعلوم دیوبند
دنیائے اسلام کی چند عظیم شخصیتیں	عطاء الرحمٰن قاسمی	شاہ ولی اللہ اکیڈمی نئی دہلی
ذکر طیب	حافظ محمد اکبر شاہ بخاری	دارالکتاب دیوبند
نقوش رفتگان	مولانا محمد تقی عثمانی	ادارۃ المعارف، کراچی
مکالمۃ الصدرین	مولانا محمد طاہر قاسمی	مطبع قاسمی دیوبند
پرانے چراغ	مولانا ابوالحسن علی ندوی	ادارہ تحقیقات ونشریات لکھنؤ
دینی دعوت کے قرآنی اصول	مولانا قاری محمد طیب	مجلس معارف القرآن دیوبند

تحدیث نعمت	مولانا محمد منظور نعمانی مرتب: عتیق الرحمٰن سنبھلی	الفرقان بک ڈپو لکھنؤ
خاتمہ السوانح		
اسلام اسلامی فکر اور مسلک دیو بند	مفتی فضیل الرحمٰن ہلال	جامعہ دار السلام مالیر کوٹلہ
ہفت روزہ عقائد دیو بند		
ماہنامہ الرشید لاہور		
ہفت روزہ خدام دین لاہور		
ماہنامہ الفرقان لکھنؤ		
ندائے دار العلوم دیو بند		
ماہنامہ البلاغ کراچی		
ماہنامہ البینات کراچی		
ماہنامہ صدائے اسلام پشاور		
ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک		

مکتبہ العزیز جامع مسجد دیوبند.

ہدایۃ النحو کی لاجواب اردو شرح

سراج النحو

ہدایۃ النحو عربی زبان کے نحوی قواعد کی بڑی جامع کتاب ہے. دینی مدرسوں کے نصاب میں شامل اس کتاب کی اردو شرح سراج النحو کے نام سے مشہور عالم دین دار العلوم دیوبند کے مفتی کفیل الرحمٰن صاحب نے مرتب کی ہے. ہدایۃ النحو کا عربی متن مع اعراب. اس کے نیچے سلیس ترجمہ اور پھر متن کے ہر گوشہ کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ پورا مسئلہ نکھر کر سامنے آجائے.

ہدایۃ النحو کی اتنی عمدہ اور مفید شرح شاید ہی اس سے پہلے سامنے آئی ہو.

آفسیٹ کی حسین طباعت.

ایک نئی اور معلوماتی کتاب-قرآن حکیم کی

عددی معلومات

قرآن کریم میں کل کتنے جملے ہیں، کل کتنے حروف ہیں، کونسا حرف کتنی بار استعمال ہوا ہے، نقطوں کی تعداد کتنی ہے، کن پیغمبروں کا ذکر قرآن حکیم میں ہوا ہے اور کتنی بار ہوا ہے، اور کس پیغمبر کا ذکر کس پارے میں اور کس سورت میں ہوا ہے. آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ قرآن حکیم میں کتنی بار ہوا ہے اور کس کس نام کے ساتھ ہوا ہے، کس سورت میں کتنی آیات ہیں، کتنے زیر وزبر ہیں، کتنے مد اور کتنے پیش ہیں اور اسی طرح کی دیگر تفصیلات پر مشتمل مختصر لیکن مفید ترین کتاب.

سراج المنیر شرح اردو الفیۃ الحدیث

تالیف: مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی، مفتی دار العلوم دیوبند، یوپی

مدارس عربیہ کے نصاب میں شامل حدیث کی اس مختصر کتاب کی اب تک کوئی شرح نہیں تھی. مکتبہ العزیز نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی اردو شرح لکھوانے کا اہتمام کیا. اس کی شرح مشہور عالم دین اور بہت سی کتابوں اور شروحات کے مصنف مفتی کفیل الرحمٰن عثمانی نے تحریر فرمائی ہے. انکی تحریر کردہ ہر شرح مقبول عوام وخواص ہوئی ہے. اور بڑی مستند مانی جاتی ہے.

سراج المنیر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت مختصر اور جامع ہے. اس میں افراط اور تفریط سے پرہیز کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں کتاب کو حل کیا گیا ہے. طلبہ اساتذہ اور عام لوگوں کے لئے یکساں مفید ہے. عمدہ کاغذ و کتابت و آفسیٹ کی بہترین طباعت، جلد سے مزین

اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب - اقوال زریں یعنی

علم و حکمت کی باتیں

تالیف: مولانا حسن احمد صاحب صدیقی، فاضل دارالعلوم دیوبند

بزرگوں کے اقوال اور ملفوظات پر بے شمار کتابیں کتب خانوں میں موجود ہیں اور ان میں بعض کتابیں چندے آفتاب چندے ماہتاب بھی ہیں، لیکن اکابرین کے قیمتی اقوال اور ملفوظات پر مشتمل ''علم و حکمت کی باتیں'' سب سے زیادہ انوکھی، مؤثر اور نرالی کتاب ہے، اس کتاب میں ایسے بے شمار اقوال بھی جمع کر دیئے گئے ہیں، جو اس سے پہلے عام لوگوں کی نظروں سے نہیں گذرے ہونگے۔ ''علم و حکمت کی باتیں'' بالعموم تمام ہی حضرات اور بالخصوص ان حضرات کے لئے ایک گرانقدر علمی اثاثہ ہے جو تقریر و خطابت کی مشق میں مصروف ہوں۔ یہ کتاب صرف نئے مقررین ہی کے لئے نہیں بلکہ منجھے منجھائے مقرروں اور خطیبوں کیلئے بھی ایک لاجواب تحفہ ہے۔

سراج المطالب اردو شرح کافیہ لابن حاجب

تالیف: مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی مفتی دارالعلوم دیوبند

علامہ ابن حاجبؒ کی تمام ہی مدارس میں داخل درسی کتاب ''کافیہ'' کی ایسی شرح اردو میں درکار تھی جو نہ اس قدر طویل ہو کہ دیکھنے والا اکتا جائے اور نہ اس قدر مختصر ہو کہ مطالب ادھورے رہ جائیں اب تک اس طرح کی شرح سامنے نہیں آئی تھی۔ مکتبہ العزیز نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ''کافیہ'' کی عمدہ ترین شرح پیش کرنے کا اہتمام کیا۔ اول عربی عبارت کا سلیس ترجمہ، پھر آسان عبارت میں دلنشیں و عام فہم تشریح، مشکل الفاظ کی سہل انداز میں تفسیر و توضیح، طرز تفہیم ایسا کہ قاری کتاب پڑھتا اور سمجھتا جائے اور تشنگی دور ہوتی جائے صوری و معنوی حسن سے آراستہ اس دیدہ زیب شرح کو پڑھیئے اور شارح کی عرق ریزی اور کاوش سے فائدہ اٹھائیے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک بار اسے پڑھنے اور دیکھنے والا دوسرے کو پڑھنے کی ترغیب نہ دے۔

آفسیٹ کی عمدہ طباعت۔

وُہ بندۂ مولاصفات

- یکے از بانیان ”دارالعلوم دیوبند“ مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے پوتے مفتی اعظم ہند مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے صاجزادے، مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے برادر خورد حضرت مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانی (استاذ شعبۂ تجوید وقرأت دارالعلوم دیوبند) کی زندگی کے چند گوشے، اہم واقعات اور تاثرات۔
- سیرت نبوی ﷺ کے آئینے میں ایک ایسے باعمل انسان کی زندگی کی جھلک جس نے بدلتے ہوئے حالات، ناسازگار ماحول میں سنت نبوی ﷺ اور طریقۂ تربیت نبوی کو برت کر دکھایا۔
- اس انسان کی زندگی ـــــ سنت جس کی طبیعت اور عادت بن گئی تھی ـــــ اندھیروں میں روشنی کا ایک دیا، جس نے چراغ حرم سے کسب نور کرکے یہ ثابت کردیا کہ حالات کی کروٹیں کچھ بھی ہوں، زندگی کا وہی طریقہ مستحکم اور پائیدار ہے جس کا نمونہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتا ہے۔
- ہمارے لئے بھی، آپ کے لئے بھی، اور آنے والی نسلوں کیلئے بھی ـــــ سادہ متوازن، اور صاف ستھری زندگی کا ایک عملی نمونہ۔

MAKTABA AL-AZIZ

JAMA MASJID DEOBAND-247554

PHONE: 01336-224018

pantone Ph: 01336-224268